تعارف

تنظیمِ اسلامی

○

پس منظر

اور

اساسی نظریات

67/اے، علامہ اقبال روڈ، گڑھی شاہو، لاہور۔فون 36316638-36366638
فیکس 36271241 ای میل: markaz@tanzeem.org
ویب سائٹ: www.tanzeem.org

ترتیب

صفحہ نمبر

تقدیم

تنظیم اسلامی اگرچہ تاحال ایک مختصر سے قافلے کی حیثیت رکھتی ہے، تاہم بحمداللہ اس کا اجمالی تعارف، کسی نہ کسی درجہ میں، نہ صرف پاکستان کے طول وعرض، بلکہ بیرونی ممالک میں بھی کم از کم اردو بولنے والوں کی حد تک بہت وسیع پیمانے پر ہو چکا ہے — اندریں حالات ضرورت محسوس ہو رہی تھی کہ اس کے اساسی نظریات، جو تاحال مختلف کتابچوں کی صورت میں وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہے ہیں' انہیں افادۂ عام کے لئے یکجا کر دیا جائے — تاکہ ایک جانب کسی بھی نئے شخص کے لئے تنظیم کے مقاصد اور نظریات کے سمجھنے میں سہولت پیدا ہو جائے، اور دوسری جانب اُس کے اہداف ومقاصد اور ہیئت تنظیمی کے ضمن میں جو ارتقائی عمل بروئے کار آیا ہے وہ بھی واضح اور معین ہو جائے۔ چنانچہ یہی پیش نظر کتاب کی اشاعت کا اصل مقصد ہے۔

مختصر ترین الفاظ میں تنظیم اسلامی کی اجتماعی مساعی کے اہداف ومقاصد اور اس کی موجودہ ہیئت تنظیمی کا جامع ومانع، تعارف مندرجہ ذیل دو جملوں کے ذریعے ہو سکتا ہے جو تنظیم کے ''نظام العمل'' کی پہلی دفعہ (شق اول) سے ماخوذ ہیں:

۱۔ یہ ایک اصولی ''اسلامی'' انقلابی جماعت ہے جو پہلے پاکستان اور بالآخر کل روئے زمین پر اللہ کے دین کے غلبے، یعنی اسلام کے نظام عدل اجتماعی کے قیام، یا بالفاظ دیگر اسلامی انقلاب، کے لئے کوشاں ہے۔

۲۔ اس کی تنظیمی اساس 'سمع وطاعت فی المعروف' کی شخصی بیعت پر قائم ہے۔

تاہم اس کا ایک طویل پس منظر ہے، جسے ؏ ''دیکھئے کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک!'' کے مصداق پیش نظر رکھنا مفید ہی نہیں، ضروری ہے!

''تنظیم اسلامی'' کا نام پہلی بار اب سے تئیس سال قبل اُس ہیئت تنظیمی کے ضمن میں سامنے آیا تھا جس کے قیام کا فیصلہ اُس اجتماع میں کیا گیا جو ۸۔۹ ستمبر ۱۹۶۷ء کو رحیم یار خان میں منعقد ہوا تھا اور جس میں لگ بھگ چالیس کی تعداد میں ایسے حضرات نے شرکت کی تھی جو اکثر وبیشتر ۵۸۔۱۹۵۷ء میں' اور بعض بعد میں مختلف مراحل پر جماعت اسلامی پاکستان سے علیحدہ ہوئے تھے — اُس اجتماع میں ان سطور کا عاجز وناچیز راقم بھی موجود تھا جو علم وفضل اور تقویٰ وتدیّن کے اعتبار سے تو کمترین تھا ہی، جہاں تک یاد پڑتا ہے عمر میں بھی سب سے کم تھا — یہ دوسری بات ہے کہ اس اجتماع کا انعقاد اصلاً اُسی کی تحریک وتحریض اور ڈیڑھ دو سال کی انتھک مساعی کا نتیجہ تھا۔

۵۸۔۱۹۵۷ء کے دوران میں مولانا مودودی مرحوم کے جن قریب ترین رفقاء نے جماعت اسلامی سے علیحدگی اختیار کی تھی، اُن میں اُن چاروں حضرات کے علاوہ جنہیں مولانا مرحوم کی نظربندی کے دوران مختلف مواقع پر امارت جماعت کی ذمہ داری تفویض کی جاتی رہی تھی[1] جماعت کی قیادت کی صف دوم کا بہت بڑا حصہ شامل تھا، اُن میں سے بعض حضرات تو اس درجہ مایوس اور دل شکستہ ہو گئے تھے کہ انہوں نے نئی تشکیل و تعمیر کی کسی کوشش میں قطعاً کوئی حصہ نہ لیا (جیسے مولانا عبدالجبار غازی مرحوم اور جناب سعید احمد ملک صاحب) لیکن بقیہ اکابرین میں سے مولانا امین احسن اصلاحی، مولانا عبدالغفار حسن اور حکیم عبدالرحیم اشرف نے بھرپور کوشش کی کہ کوئی نئی ہیئت تنظیمی فوری طور پر وجود میں آ جائے۔ ان کی اس کوشش میں جماعت سے علیحدگی اختیار کرنے والے اُن عام ارکان کی اکثریت بھی شریک تھی جو معتد بہ تعداد میں لاہور، لائلپور (حال فیصل آباد) اور منٹگمری (حال ساہیوال) سے تعلق رکھتے تھے — لیکن افسوس کہ مختلف اسباب کی بناء پر یہ مساعی ناکام رہیں، اور جماعت کے سابق ارکان پر مشتمل کوئی نئی اجتماعیت وجود میں نہ آ سکی، جس کے نتیجے میں ایک عمومی مایوسی اور بددلی اس پورے حلقے میں پھیل گئی۔

واضح رہے کہ اگرچہ ان جملہ مساعی میں راقم الحروف بھی ایک ادنیٰ کارکن کی حیثیت سے شامل رہا تھا، تاہم ایک طویل عرصے تک ان کا اصل اعصابی مرکز بھی لائلپور رہا تھا، اور اُن کی روح رواں کی حیثیت بھی حکیم عبدالرحیم اشرف صاحب ہی کو حاصل رہی تھی — البتہ کچھ عرصہ بعد جب محسوس ہوا کہ حکیم صاحب موصوف کچھ زیادہ ہی مایوس اور بددل ہو گئے ہیں، تو راقم نے ذاتی تحریک اور منٹگمری کے احباب کے تعاون سے ایک بھرپور مشاورتی اجتماع کا اہتمام کیا جو عزیز ٹینریز، ہڑپہ میں منعقد ہوا اور کئی روز تک جاری رہا۔ لیکن افسوس کہ یہ کوشش بھی ناکام رہی۔ نتیجتاً مایوسی کے سائے مزید گہرے ہو گئے — اور ۶۱۔۱۹۶۰ء کے لگ بھگ جماعت سے علیحدہ ہونے والے اکابر اور عام ارکان کے حلقے میں کسی نئی تعمیر وتشکیل کے ضمن میں کسی عملی سعی وجہد تو کجا، مستقبل قریب میں اس کی کسی اُمید کے آثار بھی باقی نہ رہے، اور بالعموم وہ فضا طاری ہو گئی جس کا نقشہ ان الفاظ میں سامنے آتا ہے کہ ؏ ''اب یہاں کوئی نہیں، کوئی نہیں آئے گا!'' — اگرچہ بحمداللہ اس وقت بھی ذاتی طور پر راقم کے قلبی احساسات کی کیفیت یہ تھی کہ ؏ ''آگ بجھی ہوئی نہ جان، آگ دبی ہوئی سمجھ!''

راقم الحروف اوائل ۶۲ء سے اواخر ۶۵ء تک بعض خاندانی مسائل کی بناء پر کراچی میں مقیم رہا اور اس اثناء میں مولانا عبدالغفار حسن بھی مدینہ منورہ منتقل ہو گئے، جہاں اُن کا تقرر جامعہ اسلامیہ میں بحیثیت استاذِ حدیث ہو گیا تھا۔

---

[1] یعنی مولانا عبدالجبار غازی مرحوم، مولانا امین احسن اصلاحی، مولانا عبدالغفار حسن اور شیخ سلطان احمد

اواخر ۱۹۶۵ء میں راقم تعمیر جدید اور تشکیل نو کے عزم تازہ کے ساتھ لاہور منتقل ہوا تو اس نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ اپنا وہ اختلافی بیان جو اُس نے ۱۹۵۶ء میں جماعت اسلامی کی مرکزی مجلس شوریٰ کی مقرر کردہ جائزہ کمیٹی کی خدمت میں پیش کیا تھا ''تحریک جماعت اسلامی: ایک تحقیقی مطالعہ'' کے نام سے شائع کر دیا، جو دینی حلقوں اور مذہبی جماعتوں کے علاوہ اخبارات و جرائد میں بھی شدّ ومدّ کے ساتھ زیر بحث آیا، جس کے نتیجے میں، سابقینِ جماعت کے حلقے میں بھی کسی نئی تعمیر و تشکیل کی خواہش از سرِ نو انگڑائی لینے لگی۔ چنانچہ ۱۹۶۶ء میں جب مولانا عبدالغفار حسن اپنی سالانہ تعطیلات پر پاکستان آئے تو انہوں نے راقم کے ساتھ کامل اتفاق کرتے ہوئے نہ صرف کراچی اور لاہور بلکہ بعض دوسرے مقامات پر بھی سابق ارکان جماعت کو ایک نئی تنظیم کے قیام پر آمادہ کرنے کی بھرپور کوشش کی اور اُن کی ان مساعی کے نتیجے میں بہت سے لوگوں کے دلوں میں قیام اجتماعیت کی وہ چنگاری جو خاکستر کی موٹی تہہ میں دب چکی تھی دوبارہ پورے آب و تاب کے ساتھ بھڑک اُٹھی۔

مولانا موصوف تو اپنی تعطیلات کے اختتام پر واپس مدینہ منورہ چلے گئے۔ لیکن اُن کی غیر حاضری میں شیخ سلطان احمد صاحب نے اُن کی نیابت کا حق بخوبی ادا کیا — اور نہ صرف مفصل خط و کتابت کے ذریعے بلکہ اپنی شدید خانگی اور کاروباری مصروفیات کے علی الرغم ایک رفیق کی معیت میں پاکستان کے متعدد اہم مقامات کے سفر کی صعوبت جھیل کر اس تحریک کے پودے کو پروان چڑھایا — نتیجتاً جون ۱۹۶۷ء میں آں محترم اور یہ خاکسار رحیم آباد ضلع رحیم یار خاں میں سردار محمد اجمل خان لغاری مرحوم کے دولت کدے پر جمع ہوئے، جہاں طویل گفت و شنید اور بحث و تمحیص کے بعد ہم تینوں نے ایک قرار داد پر دستخط ثبت کر دیئے جو جولائی ۱۹۶۷ء کے میثاق میں قرار داد رحیم آباد کے نام سے شائع ہوگئی۔

اس قرار داد کا اکثر و بیشتر حصہ تو وہی ہے جو تنظیم اسلامی کی قرار داد تاسیس کے عنوان سے اس کتاب کے صفحات ۲۵، ۲۶ پر درج ہے۔ البتہ اُس کے پہلے پیراگراف کی بجائے ''قرار داد رحیم آباد میں حسب ذیل عبارت درج تھی:

''ہم اس امر پر اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں کہ جس نے ہماری راہ کے موانع کو دور فرمایا اور حالات کو اس طرح ساز گار فرمایا کہ ہم ایک بار پھر ایک دوسرے کے نقطہ نظر کو سمجھنے کے لئے ایک مقام پر جمع ہو سکے۔

ہمارے نزدیک یہ بھی اللہ تعالیٰ کا خصوصی فضل و کرم اور انعام و احسان ہے کہ گفت و شنید کے نتیجہ میں ہم نے محسوس کیا کہ بحمد اللہ ہمارے نقطہ نظر اور طرز فکر میں بہت حد تک یکسانی و یک رنگی موجود ہے اور ہم دین کی کسی چھوٹی یا بڑی خدمت کے لئے جمع ہو کر سعی و جہد کر سکتے ہیں۔

بنا بریں ہم یہ طے کرتے ہیں کہ ایک ایسی اجتماعیت کا قیام عمل میں لایا جائے جو دین کی جانب سے عائد کردہ جملہ انفرادی و اجتماعی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے میں ہماری مدد و معاون ہو۔ جس میں وہ لوگ بھی شریک ہوسکیں جو اپنی ذمہ داریوں کی ادائیگی کے لئے جماعت اسلامی میں شامل ہوئے تھے لیکن پھر مختلف مراحل پر اس سے مایوس ہو کر علیحدہ ہوتے چلے گئے اور اب کسی ہیئت اجتماعی میں منسلک نہ ہونے کی بناء پر تشنگی محسوس کر رہے ہیں اور وہ لوگ بھی شریک ہوسکیں جنہیں اپنے دینی فرائض کا احساس ہو جائے اور وہ اپنی اجتماعی ذمہ داریوں کی ادائیگی کے لئے کسی اجتماعی نظم میں منسلک ہونا چاہیں۔''

اور اختتام پر ان الفاظ کا اضافہ تھا:

''مندرجہ بالا رہنما اصولوں کی روشنی میں تفصیلی نقشہ کار کی تعیین اور ایک ہیئت اجتماعی کی تشکیل کے لئے طے کیا جاتا ہے کہ جس قدر جلد ممکن ہو، ہم خیال لوگوں سے رابطہ کیا جائے اور پھر کوئی ایسی صورت اختیار کی جائے کہ ایسے لوگ ایک جگہ جمع ہو کر کسی اجتماعیت کے قیام کی عملی صورت اختیار کر لیں۔

اس کام کی انجام دہی کے لئے فی الحال شیخ سلطان احمد (صاحب) کو مامور کیا جاتا ہے۔

واضح رہے کہ اس قرار داد کو بھی الفاظ کا جامہ راقم الحروف ہی نے پہنایا تھا اور پھر جب راقم نے لاہور واپس آ کر اسے مولانا امین احسن اصلاحی کی خدمت میں پیش کیا اور اُن کی جانب سے اس کی بحیثیت مجموعی تائید و تحسین کے بعد طے کیا گیا کہ اس کی ایک مختصر وضاحت بھی ضبط تحریر میں لے آئی جائے تو یہ خدمت بھی راقم ہی نے سرانجام دی — دریں اثناء لاہور میں منعقدہ ایک اجتماع میں مجوزہ اجتماعیت کے ضمن میں ایک مجلس مشاورت کا قیام عمل میں آ چکا تھا جس کے ایک اجلاس میں نہ صرف ''قرار داد رحیم آباد'' بلکہ متذکرہ بالا توضیحات کو بھی معمولی حکّ و اضافے کے ساتھ منظور کر لیا گیا۔ چنانچہ، میثاق، بابت اگست ۱۹۶۷ء میں یہ تمام چیزیں ''مجلس مشاورت'' کی جانب سے شائع ہوگئیں اور اُن کی اساس پر ایک اجتماع ۸۔۹ ستمبر کو بمقام رحیم یار خان طلب کر لیا گیا۔

رحیم یار خان میں ۶۔۷ ستمبر کو مجلس مشاورت کا اجتماع ہوا......اور بعد ازاں ۸۔۹ ستمبر کو کھلے اجلاس

ہوئے جن میں اولاً راقم ہی نے مجوزہ قرارداد اور اس کی توضیحات پڑھ کر سنائیں۔ پھر مولانا امین احسن اصلاحی اور مولانا عبدالغفار حسن نے مزید تائیدی اور توضیحی تقریریں کیں۔ شرکاء اجتماع کی جانب سے بعض لفظی ترامیم بھی پیش ہوئیں...... اور بالآخر قرارداد کو مع توضیحات منظور کر لیا گیا۔ صرف اس فرق کے ساتھ کہ قرارداد رحیم آباد کے ان ابتدائی تین پیروں کی بجائے، جو اوپر نقل ہو چکے ہیں، یہ پیرا شامل کیا گیا:

''آج ہم اللہ کا نام لے کر ایک ایسی اسلامی تنظیم کے قیام کا فیصلہ کرتے ہیں جو دین کی جانب سے عائد کردہ جملہ انفرادی و اجتماعی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے میں ہماری ممد و معاون ہو۔''

اور اسی طرح قرارداد رحیم آباد کے محولہ بالا آخری الفاظ درج کئے گئے کہ:

''مندرجہ بالا رہنما اصولوں کی روشنی میں عملی جدوجہد کے آغاز اور ایک ہیئت اجتماعی کی باقاعدہ تشکیل کے لئے مندرجہ ذیل اصحاب پر مشتمل ایک مجلس مشاورت کے تقرر کی توثیق کی جاتی ہے۔''

۱۔ مولانا امین احسن اصلاحی ۔۔۔ ۲۔ مولانا عبدالغفار حسن
۳۔ مولانا عبدالحق جامعی ۔۔۔ ۴۔ شیخ سلطان احمد (معتمد)
۵۔ سردار محمد اجمل خان لغاری ۔۔۔ ۶۔ ڈاکٹر محمد نذیر مسلم
اور ۔ ۷ ڈاکٹر اسرار احمد

'میثاق' کی ستمبر/اکتوبر ۱۹۶۷ء کی مشترکہ اشاعت میں ترمیم شدہ قرارداد اور توضیحات بھی شائع کر دی گئیں اور مولانا امین احسن اصلاحی اور مولانا عبدالغفار حسن کی تقاریر بھی مزید برآں صرف قرارداد اور اس کی توضیحات کو ''ایک نئی اسلامی تنظیم کے قیام کا فیصلہ'' کے عنوان سے ایک کتابچے کی صورت میں بھی شائع کر دیا گیا تاکہ اسے زیادہ وسیع حلقے تک پہنچایا جا سکے۔

یہ عرض کرنے کی کوئی حاجت نہیں ہے کہ اگرچہ اس نئی تنظیم کی سربراہی یا امارت کے لئے تاحال رسمی طور پر کسی کا نام نہ تجویز ہوا تھا نہ منظور، لیکن اس ''بارات کے دولہا'' بہر حال مولانا امین احسن اصلاحی ہی تھے...... اور اگرچہ اس نئی ہیئت اجتماعی کے نام کے بارے میں بھی متعدد تجاویز کے پیش ہونے کے باوجود کوئی حتمی فیصلہ نہیں ہو سکا تھا، تاہم چونکہ مولانا امین احسن اصلاحی ''تنظیم اسلامی'' کے نام پر مُصر تھے، لہٰذا غیر رسمی طور پر یہ نام بھی تقریباً طے شدہ ہی تھا۔ اگرچہ راقم الحروف نے یہ احتیاط ملحوظ رکھی تھی کہ یہ اسم علَم نہ 'میثاق' میں استعمال ہوا نہ متذکرہ بالا کتابچے میں۔

اجتماع رحیم یار خان میں اپنے الوداعی خطاب میں بھی مولانا اصلاحی نے اپنی سابقہ تقصیر کے اعتراف کے ساتھ آئندہ کے لئے عزم مصمّم کا اظہار کیا تھا اور اس کے بعد بھی چند ماہ تک ان کی طبیعت میں نشاط کی کیفیت برقرار رہی اور ع ''ہوتا ہے جادہ پیما پھر کارواں ہمارا'' کے سے انبساط و انشراح کا اظہار ہوتا رہا۔ چنانچہ بعض چھوٹے اسفار کے علاوہ ایک طویل سفر بھی انہوں نے از لاہور تا سکھر بذریعہ کار اور وہاں سے کراچی بذریعہ ریل کیا جس میں راقم بھی حضرت موسیٰ کے فتیٰ کے مانند اُن کے ساتھ رہا۔

لیکن افسوس کہ ایک حادثہ تو اس سفر کے دوران سکھر میں ایک اجتماع عام کے موقع پر پیش آ گیا...... اور بعض دوسرے حوادث اس کے کچھ عرصہ بعد رونما ہو گئے جن کے نتیجے میں ایک جانب تو مولانا اصلاحی کی طبیعت بجھ کر رہ گئی...... اور دوسری جانب بعض اہم رفقاء کے مزاج میں بھی تکدّر پیدا ہو گیا...... چنانچہ جماعت اسلامی کے ساتھ سابق تعلق کی قدرِ مشترک کی اساس پر نئی تنظیم کے قیام کی یہ آخری کوشش بھی ع ''خوش درخشید و لے شعلۂ مستعجل بود،'' کی مصداق کامل بن گئی!

تاہم راقم الحروف نے اُسی وقت طے کر لیا تھا کہ اقامت دین اور اعلاء کلمۃ اللہ کے بلند و بالا مقاصد کے لئے خالص اصولی اور انقلابی طریق پر جدوجہد، یا بالفاظ دیگر اسلامی انقلاب کی سعی کے لئے ٹھیٹھ اسلامی اصولوں پر کسی نئی تحریک کے اجراء اور تنظیم کے قیام کے لئے خود اپنی بساط کے مطابق کوشش جاری رکھے گا۔ خواہ اُسے نئے سفر اور نئی تعمیر و تشکیل کے لئے تنہا ہی آغاز کرنا پڑے۔

لاہور میں حلقہ ہائے مطالعہ قرآن اور ''دارالاشاعت الاسلامیہ'' کا قیام اور ماہنامہ میثاق کا دوبارہ اجراء پہلے ہی عمل میں آ چکا تھا۔ چنانچہ قرآن حکیم کے انقلابی فکر اور ولولہ انگیز دعوت کی اساس پر ہم خیال لوگوں کا ایک بالکل نیا حلقہ وجود میں آ چکا تھا جو فطری تدریج کے ساتھ مسلسل ترقی کر رہا تھا۔ چنانچہ اب راقم نے اپنے جسم و جان کی تمام توانائیوں کو بالکل یکسو ہو کر اور ع ''شرط اوّل قدم این است کہ مجنوں باشی'' کے سے انداز میں قرآن کی انقلابی دعوت کے نشر و اشاعت پر مرکوز کر دیا۔[1] جس کے نتیجے میں اولاً ۱۹۷۲ء میں مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کا قیام عمل میں آیا اور ۲۱ر جولائی ۱۹۷۵ء کی شام کو اکیس روزہ قرآنی تربیت گاہ کے اختتام پر راقم نے اپنے اس فیصلے کا اعلان کر دیا کہ آئندہ معاملہ صرف قرآن کے درس و تدریس اور تعلیم و تعلم تک محدود نہیں رہے گا اور صرف ''انجمن'' پر اکتفا نہیں ہوگی بلکہ اقامت دین کی اجتماعی جدوجہد کے لئے ایک باضابطہ جماعت کا قیام عمل میں لایا جائے گا۔

----

[1] اس کی تفصیلی روداد کے لئے ملاحظہ ہو راقم کی تالیف ''دعوت رجوع الی القرآن کا منظر و پس منظر!''

راقم الحروف کی متذکرہ بالا تقریر، تسوید و تبییض کے جملہ مراحل طے کر کے بعض اضافوں کے ساتھ کچھ ''میثاق'' بابت ستمبر ۱۹۷۴ء میں اور بقیہ اکتوبر اور نومبر کی مشترک اشاعت میں شائع ہوگئی جس کے ذریعے راقم نے اپنا ذہنی و فکری پس منظر، سابقہ تحریکی و جماعتی تعلق اور فرائض دینی کے بارے میں اپنا تصور پوری طرح واضح کر دیا۔ (یہ تقریر جو پہلے ''سرافگندیم'' کے نام سے طبع ہوتی رہی تھی، اب ''عزمِ تنظیم'' کے عنوان سے شائع ہو رہی ہے)۔

پھر 'میثاق' بابت اکتوبر نومبر میں راقم نے ایک جانب ایک طویل مقالے کے ذریعے امّتِ مسلمہ کی چودہ سو سالہ تاریخ کے دوران عروج اور زوال کے دو دو ادوار کی وضاحت اور تیسرے عروج کی جانب پیش قدمی کے ضمن میں ''ہمہ جہتی اور احیائی عمل'' کے مختلف گوشوں کی تعیین کے ساتھ یہ بات بھی واضح کر دی کہ راقم اور اُس کی تجویز کردہ تنظیم اُن میں سے کون سے گوشے سے تعلق رکھتی ہے اور دوسری جانب ۱۹۶۷ء کے اجتماع رحیم آباد کی منظور کردہ قرارداد مع توضیحات بھی شائع کر دی اور مولانا امین احسن اصلاحی اور مولانا عبدالغفار حسن کی تقاریر کے علاوہ وہ تائیدی تبصرے بھی شائع کر دیئے جو ۶۷-۶۸ء میں مولانا عبدالماجد دریابادی اور مولانا عبدالباری ندوی رحمہ اللہ نے کیے تھے...... اور اعلان کر دیا کہ ان ہی فکری و نظری اساسات پر ایک نئی تنظیم کی تشکیل اگلے سال (۱۹۷۵ء) کے اوائل میں ہو جائے گی!

۱۹۶۷ء کی قرارداد کے بارے میں راقم الحروف کو اس وقت بھی یہ احساس تھا کہ اس میں اقامت دین کی فرضیت کا تصور کچھ دب گیا ہے اور اس کی اہمیت کما حقہ، واضح نہیں ہو رہی...... اور اگرچہ دین کی اقامت کی اصطلاح اس میں موجود ہے تاہم بحیثیت مجموعی اُس سے اصلاً ایک تبلیغی اور اصلاحی تحریک کا نقشہ سامنے آتا ہے۔ اس کا اصل سبب بھی راقم کے سامنے واضح تھا، یعنی یہ کہ جماعت اسلامی کی تحریک کی قلب ماہیت اور ایک اسلامی انقلابی جماعت کے بجائے اسلام پسند قومی سیاسی جماعت کا انداز اختیار کر لینے اور اس کے نتیجے میں اُس کے کارکنوں کے مزاج میں سیاسی رنگ کے غلبے نے سابقین جماعت کے حلقے میں ردّعمل کے طور پر ''دودھ کا جلا چھاچھ بھی پھونک کر پیتا ہے!'' ...... اور ''سانپ کا ڈسا رسی سے بھی ڈرتا ہے!'' کے مطابق ''انقلاب کے لفظ سے وحشت (Allergy) پیدا کر دی تھی...... اس کے باوجود راقم نے نئی تشکیل کے لئے قرار دادِ تاسیس کے طور پر اُسی کو اختیار کیا۔ اس لئے کہ ایک تو اس کی شدید خواہش تھی کہ ۱۹۶۷ء میں جمع ہونے والے تمام بزرگ اور احباب اس میں شمولیت اختیار کر لیں اور اس ضمن میں اُن پر یہ حجت قائم ہو جائے کہ نئے سفر کا آغاز ٹھیک اسی مقام سے کیا جا رہا ہے جہاں سے سات سال قبل قافلہ منتشر ہوا تھا...... اور دوسرے اسے یقین تھا کہ جیسے ہی قافلہ مصروف سفر ہوگا سابقہ تجربات اور ایک طویل عرصے کے جمود کے باعث جو وحشت پیدا ہوگئی ہے خود بخود رفع ہو جائے گی اور...... ع ''پھر دلوں کو یاد آ جائے گا پیغام سجود!'' کے مصداق سب بھولے ہوئے سبق دوبارہ یاد آ جائیں گے۔ (جس کا ایک ثبوت بھی راقم کو بالکل ابتدائی مرحلے ہی پر مل گیا تھا جس کی تفصیل یہ ہے کہ سردار محمد اجمل خان لغاری مرحوم کے مزاج میں متذکرہ بالا وحشت کی شدت کے باعث قرارداد رحیم آباد میں ان الفاظ کے بعد کہ: ''لہٰذا پیش نظر اجتماعیت کی نوعیت ایسی ہونی چاہئے کہ اس میں فرد کی دینی اور اخلاقی تربیت کا کما حقہ، لحاظ رکھا جائے!'' مزید تاکید اور حزم و اختیار کے لئے یہ الفاظ بھی شامل تھے کہ ''اور اُسے محض کسی اجتماعی انقلاب کے لئے آلہ کار کی حیثیت نہ دے دی جائے!''...... لیکن جیسے ہی جمود ٹوٹا اور حرکت کا آغاز ہوا تو اس وحشت کی شدت میں فوراً کمی آ گئی۔ چنانچہ رحیم یار خان میں منظور ہونے والی قرارداد سے یہ الفاظ حذف کر دیئے گئے۔

تنظیم اسلامی کا تاسیسی اجلاس ۲۷/اور ۲۸ مارچ ۱۹۷۵ء کو مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے دفتر واقع ۱۲۔اے، افغانی روڈ، سمن آباد لاہور میں منعقد ہوا۔ جس میں لاہور کے علاوہ کراچی، سکھر، بہاولپور، ساہیوال، فیصل آباد، شیخوپورہ، گوجرانوالہ اور بعض دوسرے مقامات سے کُل ایک سو تین (۱۰۳) افراد شریک ہوئے۔

ان میں اوّل تو جماعتِ اسلامی سے علیحدگی اختیار کرنے والے حضرات کی کل تعداد بھی پانچ چھ سے زیادہ نہ تھی، مزید برآں وہ سب بھی جماعت کے عام ارکان میں سے تھے، اور اُن میں سے کوئی بھی جماعتِ اسلامی میں کبھی کسی منصب پر فائز نہیں رہا تھا ___ (سوائے شیخ جمیل الرحمٰن صاحب کے کہ وہ کراچی کی جماعت کے معروف اور نمایاں لوگوں میں شامل رہے تھے!) ______ گویا یہ پورا قافلہ راقم کی دعوتِ قرآنی کے نتیجے میں عالمِ وجود میں آیا تھا اور اس کے جملہ اساسی تصورات مطالعۂ قرآن حکیم کے اُس منتخب نصاب پر مبنی تھے جسے راقم نے اپنی دعوتِ قرآنی کا مرکز و محور بنایا تھا۔

چنانچہ راقم نے اس اجلاس کی افتتاحی نشست میں بھی ایک بار پھر اپنے مطالعۂ قرآن کا نچوڑ پیش کیا اور سورۃ الصّف کے دوسرے رکوع اور سورۃ الحجرات کی آیات ۱۴۔۱۵ کے حوالے سے فرائضِ دینی کا جامع تصور اور اس کے ضمن میں شہادت علی الناس اور غلبۂ اقامتِ دین کی جدوجہد کی فرضیت اور اس کے لئے التزام جماعت کی اہمیت پر زور دیا۔ اس کے ساتھ ہی راقم نے ۶۷ء والی قراردادِ تاسیس مع توضیحات پڑھ کر سنائی اور اس کی پُر زور وکالت کی، صرف اس لئے نہیں کہ یہ اس کے اپنے رشحاتِ قلم تھے، بلکہ اس لئے کہ اقامتِ دین کے بلند و بالا مقصد کے لئے جو مردانِ کار درکار ہیں اُن کی فراہمی اور سیرت سازی کے لئے جو پروگرام اُس قرارداد اور اُس کی توضیحات کے ذریعے سامنے آتا ہے اُس کی صحت و حقانیت پر میرا دل ۱۹۷۴-۷۵ء میں بھی

اتنا مطمئن تھا، جتنا ۶۷۔۱۹۶۶ء میں۔ اور الحمد للہ کہ ان سطور کی تحریر کے وقت بھی (جنوری ۱۹۹۱ء) راقم کو یقین کامل حاصل ہے کہ فرائضِ دینی کی پہلی دو منزلوں یعنی بندگی رب اور شہادت علی الناس کے اُصول و مبادی کے ضمن میں اس قرار داد اور اس کی توضیحات کو ایک اہم اور جامع دستاویز کی حیثیت حاصل ہے۔ (چنانچہ اس کتاب کا حصہ اول اسی قرار داد اور اس کے متعلقات پر مشتمل ہے۔) ______ بہر حال چونکہ یہ اجتماع اِن ہی کی اساس پر طلب کیا گیا تھا لہٰذا اس کا کوئی امکان ہی موجود نہ تھا کہ ان کے کسی نکتے سے شرکاء اجلاس میں سے کسی کو کوئی اختلاف ہو۔ لہٰذا اِن کی منظوری کا مرحلہ بآسانی طے ہو گیا۔

اگلا مرحلہ، نام، شرائطِ شمولیت، ہیئت تنظیمی، اور قواعد وضوابط کی منظوری تھا جن میں سے نہ نام کے سلسلے میں کوئی ردّ وقدح ہوئی، نہ ہیئتِ تنظیمی، اور قواعد وضوابط کے ضمن میں کوئی مشکل پیش آئی۔ البتہ شرائطِ شمولیت میں شامل بعض کڑوی گولیوں کا نگلنا موجود الوقت حالات میں بہت سے احباب کو دشوار ہی نہیں محال نظر آیا۔ چنانچہ نام کے ضمن میں اتفاق رائے کے ساتھ ''تنظیم اسلامی'' ہی کے حق میں فیصلہ ہو گیا۔ اور اُس وقت کے دستورِ تنظیم اسلامی کی دفعہ ''ا'' قرار پائی:

''اس تنظیم کا نام **''تنظیم اسلامی''** ہوگا۔''

اسی طرح ہیئت تنظیمی کے ضمن میں حسبِ ذیل اُمور بھی بالاتفاق طے پا گئے:

دفعہ۳۔ ہیئتِ تنظیمی

تنظیمی اعتبار سے پہلے تین سال ایک عبوری دور شمار ہوں گے جن کے دوران میں مقدور بھر سعی کی جائے گی کہ تجدید ایمان، توبہ اور تجدید عہد کی وہ دعوت زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچا دی جائے جس کی تفصیل دفعہ ۲ میں دی گئی ہے تا کہ زیادہ سے زیادہ لوگ اس میں شامل ہو سکیں۔ اس عرصے کی تکمیل پر ایسے تمام لوگوں کا ایک عام اجتماع طلب کیا جائے گا جو ''تنظیم اسلامی'' کے لئے مستقل دستور طے کرے گا۔ گویا دفعاتِ آئندہ میں جو تنظیمی ڈھانچہ دیا جا رہا ہے وہ صرف اس عبوری دور کے لئے شمار ہوگا۔

دفعہ۴۔ مرکزی نظام

(الف) ڈاکٹر اسرار احمد کو تنظیمِ اسلامی کے ''داعی عمومی'' کی حیثیت ہوگی اور وہ اس دور میں ''اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ'' کے وسیع تر اصول کے تحت تنظیم کے معاملات کو بھی چلائیں گے اور اس کی دعوت کو بھی زیادہ سے زیادہ وسیع تر حلقے تک پہنچانے کی کوشش کریں گے۔ وہ ایک معین مجلسِ شوریٰ کو بھی نامزد کرنے کے مجاز ہوں گے لیکن ان کو حق استقرار حاصل ہوگا۔

(ب) تمام رفقائے تنظیم داعیٔ عمومی کی ''اطاعت فی المعروف'' کے پابند ہوں گے!

رہے ''قواعد وضوابط'' تو چونکہ اِن اصولی باتوں کے طے ہو جانے کے بعد زیادہ تفصیلی قواعد وقوانین کی چنداں ضرورت ہی باقی نہیں رہی تھی، لہٰذا وہ سب کے سب پانچ دفعات کی صورت میں کل تین صفحات میں سما گئے اور وہ بھی بالاتفاق طے ہو گئے۔

جہاں تک متذکرہ بالا دستور کی دفعہ ۲ میں شامل ''شرائطِ شمولیت'' کا تعلق تھا اس کی بھی کل چھ میں سے صرف ایک یعنی چوتھی شق ایسی تھی جو بہت سے احباب کے تنظیم میں شامل ہونے کی راہ میں رکاوٹ بن گئی۔ اس لئے کہ اُس کی رُو سے یہ لازم آتا تھا کہ صرف وہی لوگ تنظیمِ اسلامی میں شمولیت اختیار کر سکیں گے جو تجارتی اور نجی ہر نوع کے سُودی لین دین سے عملاً تائب ہو جائیں، اور ایسے اداروں کی ملازمت بھی ترک کر دیں جن میں سودی لین دین کا غلبہ ہو جیسے بنک اور انشورنس کمپنیاں وغیرہ۔ مزید برآں سرکاری محاصل یعنی انکم ٹیکس، سیلز ٹیکس وغیرہ کے ضمن میں بھی کسی غلط بیانی سے ہرگز کام نہ لیں۔ ان شدید وثقیل اور موجود الوقت احوال وظروف کے اعتبار سے تقریباً ناممکن العمل پابندیوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان ایک سو تین حضرات میں سے جو اس اجتماع میں ابتداءً شریک ہوئے تھے صرف باسٹھ حضرات نے تنظیم میں بالفعل شرکت اختیار کی۔

یہاں اس بات کی وضاحت مناسب معلوم ہوتی ہے کہ تنظیم کی ''شرائطِ شمولیت'' کی متذکرہ بالا شق بھی اصلاً جماعت اسلامی ہی کے فلسفہ واصول تنظیم کے تسلسل کی مظہر تھی۔ اور اس معاملے میں اگرچہ ذاتی طور پر راقم الحروف کے نظریات تبدیل ہو چکے تھے، تاہم چونکہ شدید دلی خواہش تھی کہ جماعت سے علیحدگی اختیار کرنے والے احباب واکابر کی زیادہ سے زیادہ تعداد اس نئے قافلے میں شامل ہو اور اُن کی اکثریت بالخصوص اہم شخصیات کے تصورات میں ابھی کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی، لہٰذا جہاں یہ مناسب سمجھا گیا کہ تنظیم کے ''مستقل دستور'' کے معاملے کو ابھی 'کھلا' (Open) رکھا جائے وہاں ''شرائطِ شمولیت'' کے ضمن میں بھی سابقہ طرزِ فکر ہی کو برقرار رکھا گیا۔

تنظیم اسلامی کے ابتدائی عارضی دستور کی دفعہ نمبر ۲، صرف مذکورہ شق نمبر ۴ میں معمولی لفظی تبدیلی کے ساتھ پیش نظر کتابچے کے حصہ دوم میں ''عقائد اور بنیادی دینی تصورات'' کے عنوان سے شامل ہے۔ یہ بھی اصلاً راقم ہی کی تحریر پر مشتمل ہے جو جولائی ۷۴ء اور مارچ ۷۵ء کے درمیانی عرصے میں سپردِ قلم ہوئی۔ اس کی ترتیب وتسوید میں راقم نے جماعتِ اسلامی کے دستور سے بھی استفادہ کیا اور بعض علماء سے بھی مشورہ کیا جن میں مولانا سید وصی مظہر ندوی قابلِ ذکر ہیں جو اگرچہ اُس وقت تک جماعتِ اسلامی میں شامل تھے تاہم اُن کی جماعت کی مقامی، صوبائی اور مرکزی قیادت کے ساتھ کشاکش شدت کے ساتھ جاری تھی جس کے نتیجے میں وہ

۶۷ء میں جماعت سے خارج کردیئے گئے۔

اس کی پہلی شق ایمانِ مجمل اور ایمان مفصل پر مشتمل ہے۔ جن کی تشریح میں اہلِ سنت کے عقائد اختصار لیکن جامعیت کے ساتھ آ گئے ہیں۔ واضح رہے کہ جماعتِ اسلامی کے دستور میں اِن کا کوئی تذکرہ نہیں ہے۔

دوسری شق کلمۂ طیبہ اور کلمۂ شہادت پر مشتمل ہے جس کی تشریح کے سلسلے میں جماعتِ اسلامی کے دستور سے بھرپور استفادہ کیا گیا ہے۔ اس لئے کہ توحیدِ الٰہی اور رسالتِ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے اقرار کے مضمرات ومقدرات کو دستورِ جماعت میں بلاشبہ نہایت عمدگی سے بیان کیا گیا ہے۔ (اور ایک روایت یہ بھی ہے کہ یہ تحریر اصلاً مولانا محمد منظور نعمانی کی ہے۔ واللہ اعلم) البتہ ایک جانب اس میں سے وہ الفاظ حذف کر دیئے گئے جن پر علماء کرام کی جانب سے شدید اعتراضات کئے گئے تھے، اور دوسری جانب عظمتِ صحابہؓ اور حجیتِ خلافتِ راشدہ سے متعلق شقوں کا اضافہ کیا گیا۔ اس لئے کہ صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نبی اکرم ﷺ کی تعلیم، تربیت اور تزکیے کا شاہکار ہونے کے اعتبار سے تعظیم و توقیر کے بھی مستحق ہیں _____ اور بفحوائے قرآنی "مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ" اور "فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَ عَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ" آنحضور ﷺ کے رفقاء واحباب اور اعوان وانصار ہونے کی بنا پر اس کا استحقاقِ کامل بھی رکھتے ہیں کہ آنحضور ﷺ کے ہر امت کے دل میں ان کے لئے شدید محبت اور احسان مندی کے جذبات موجود ہوں _____ اور خلافتِ راشدہ چونکہ اصلاً خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کی حیثیت رکھتی ہے، لہٰذا اُس کے دوران میں جن امور پر اُمت کا اجماع ہوگیا انہیں دین کے دستوری اور قانونی نظام میں حجت کی حیثیت حاصل ہے _____ اس طرح عظمتِ صحابہؓ اور حجیتِ خلافتِ راشدہ کو گویا نبی اکرم ﷺ کی رسالتِ مبارکہ کے ساتھ تتمے اور ضمیمے کی حیثیت حاصل ہے!

تیسری اور چوتھی شقیں شرک، کفر اور ذمائمِ اخلاق سے برأت، اور جملہ ذنوب ومعاصی سے توبہ واستغفار پر مشتمل ہیں۔ جن کے ضمن میں جہاں کفر اور شرک کی حقیقت اور اُن کی اقسام کی مختصر مگر جامع وضاحت آ گئی ہے، وہاں فرائض وواجباتِ دینی اور محرمات ومنہیاتِ شرعی کا اجمالی تذکرہ بھی ہوگیا ہے۔ اور ان ہی میں وہ "کڑوی گولیاں" بھی شامل ہیں جن کا ذکر پہلے کیا جاچکا ہے، یعنی کسبِ معاش کے سلسلے میں محرمات ومنکرات سے اجتناب!

جیسے کہ پہلے عرض کیا جاچکا ہے، ابتداء میں جو صورت اختیار کی گئی وہ یہ تھی کہ صرف وہی لوگ تنظیم اسلامی میں شامل ہوسکیں گے جو ان منکرات کو بالفعل ترک کرچکے ہوں، یہی وجہ ہے کہ تاسیسی اجلاس کے ابتدائی ایک سو تین شرکاء میں سے صرف باسٹھ (۶۲) حضرات تنظیم میں شمولیت اختیار کرسکے! _____ لیکن تقریباً ڈھائی سال بعد جب تنظیم کے لئے بیعت کے نظام کو اختیار کیا گیا تو متعلقہ عبارت میں بھی مناسب لفظی ترمیم کردی گئی اس لئے کہ نظامِ بیعت کا تو اصل الاصول ہی یہ ہے کہ کوئی شخص جب 'جہاں' اور جیسے ہی عزم اور ارادہ کرلے کہ وہ مسلمان جئے اور مسلمان مرے گا اور اپنے جملہ فرائضِ دینی ادا کرنے کے لئے امکان بھر کوشاں رہے گا فوراً بیعت کر کے راہِ حق کے قافلے میں شامل ہوسکتا ہے۔ تعلیم، تربیت اور تزکیے کے مراحل بعد میں آتے ہیں، گویا اب اِس شق کی حیثیت اِس پیشگی تنبیہ کی ہے کہ جو شخص بھی تنظیم میں شامل ہو وہ اچھی طرح جان لے کہ اسے اِن منکرات ومحرمات کو جلد از جلد ترک کرنا ہے۔

پانچویں اور چھٹی شق دو معاہدوں پر مشتمل ہیں: پہلا عہد اللہ سے کہ میں نے اپنا رُخ ہر جانب سے یکسو ہوکر صرف تیری جانب کرلیا ہے اور اب میری نماز اور قربانی کی طرح میرا جینا اور مرنا بھی صرف تیرے لئے ہو گا _____ اور دوسرا عہد تنظیمِ اسلامی سے کہ میں اس کے نظم کی پابندی اور اس کے ایسے جملہ احکام کی اطاعت جو شریعت کی کسی واضح نص کے خلاف نہ ہوں "سمع وطاعت" کی ٹھیٹھ اسلامی روح کے مطابق کروں گا!

ان تصریحات سے یہ بات واضح ہوگئی ہوگی کہ تنظیم کے عقائد اور بنیادی نظریات کی متذکرہ بالا چھ شقوں کا تعلق اُن تین اہم دینی اصطلاحات سے ہے جو "تنظیم اسلامی کی اساسی دعوت" کے عنوان سے چند آیاتِ قرآنیہ کے ساتھ ابتداء ہی سے جلی طور پر شائع ہوتی رہی ہیں: یعنی تجدیدِ ایمان، توبہ اور تجدیدِ عہد! ۔ چنانچہ پہلی دو شقوں کا تعلق تجدیدِ ایمان سے ہے، درمیانی دو کا توبہ سے اور آخری دو کا تجدیدِ عہد سے!!

اللہ تعالیٰ ہم سب کے قلوب واذہان کو ایمانِ حقیقی اور یقین ومعرفت کے نور سے منور فرمائے، ہمیں جملہ فرائض وواجبات کے التزامِ تام اور منکرات ومنہیات سے اجتنابِ کلی کی توفیق عطا فرمائے، اور اپنے جملہ عہُود وعقود کے ایفائے کاملہ کی ہمت عطا فرمائے۔ آمین یا رب العالمین!

ذاتی طور پر راقم الحروف کی رائے جماعت سے علیحدگی کے دو سال کے اندر اندر یعنی اپریل ۱۹۵۹ء کے لگ بھگ ہی یہ بن چکی تھی کہ اقامتِ دین کے لئے جدوجہد کرنے والی جماعت کی تنظیمی اساس بیعت کے مسنون اور ماثور اُصول پر قائم ہونی چاہئے نہ کہ عہدِ حاضر کے مغرب سے درآمد شدہ دستوری اور جمہوری اصولوں پر _____ تاہم راقم کے نزدیک نہ مقدم الذکر ہیئتِ تنظیمی فرض یا واجب کے درجہ میں ہے نہ مؤخر الذکر مباحات کے دائرے سے خارج ہے _____ یہی وجہ ہے کہ آٹھ سال بعد ۱۹۶۷ء میں اوّلاً رحیم آباد اور پھر رحیم یار خاں میں ایک نئی تنظیم کے قیام کا فیصلہ ہوا تو راقم اُس میں پُورے انشراح ہی نہیں، بھرپور جوش وخروش کے ساتھ شریک ہوا، حالانکہ جیسے کہ پہلے عرض کیا جاچکا ہے کہ، یہ بات اظہر من الشمس تھی کہ اُس "بارات کے دولہا" کی حیثیت مولانا امین احسن اصلاحی صاحب کو حاصل تھی، اور وہی بلاشبہ ریب وشک مجوزہ

تنظیم کے امیر بنتے اور اُن کے بارے میں یہ بات ظاہر و باہر اور معلوم و معروف تھی کہ اُن کا شدید رجحان ہی نہیں قطعی و حتمی رائے دستوری اور جمہوری نظام کے حق میں ہے ـــــــ اسی طرح مزید آٹھ سال بعد یعنی ۱۹۷۵ء میں جب موجودہ تنظیمِ اسلامی کی تاسیس کا مرحلہ آیا تب بھی راقم نے نظامِ جماعت کے مسئلے کو کھلا رکھا اور پہلے تین سالوں کو عبوری دور قرار دیتے ہوئے اپنی حیثیت صرف کنوینر کی رکھی تا کہ جماعتِ اسلامی سے علیحدگی اختیار کرنے والے دوسرے بزرگ حضرات بھی شمولیت پر آمادہ ہو جائیں تو اُن کے مشورے بلکہ صوابدید کے مطابق ہیئتِ تنظیمی تشکیل دے لی جائے! اور اس میں ہرگز کسی شک اور شبہ کی گنجائش نہیں تھی کہ اگر وہ حضرات شمولیت اختیار کر لیتے تو لامحالہ ایک دستوری اور جمہوری نظم ہی قائم ہوتا۔

لیکن جب دو ڈھائی سال کے انتظار کے بعد ثابت ہو گیا کہ بزرگ سابقین جماعت میں سے کوئی ایک شخص بھی اس نئے قافلے میں شمولیت پر آمادہ نہیں ہے، تو چار و ناچار راقم کو یہ فیصلہ کر لینا پڑا کہ اب اسے اپنی ذاتی صوابدید ہی کو بروئے کار لانا ہے۔ اور اپنی رائے پورے شرح و بسط کے ساتھ رفقاء کے سامنے رکھ دینا ہے۔ تا کہ بفحوائے الفاظِ قرآنی: ﴿لِيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْ بَيِّنَةٍ وَّ يَحْيٰى مَنْ حَيَّ عَنْ بَيِّنَةٍ﴾ (الانفال: ۴۲) جسے ساتھ دینا ہے وہ بھی پورے انشراحِ صدر کے ساتھ دے، اور جسے ساتھ چھوڑ دینا ہے وہ بھی خوب سوچ سمجھ کر علیحدہ ہو!

تنظیمِ اسلامی کا پہلا سالانہ اجتماع ۲۵ تا ۲۷ مارچ ۱۹۷۶ء اپنے مقامِ تاسیس ہی پر منعقد ہوا تھا اور دوسرے سالانہ اجتماع کے انعقاد کے لئے بھی اواخر مارچ ۱۹۷۷ء کی تاریخوں کا تعین ہو چکا تھا کہ اچانک ملکی انتخابات میں حکومتِ وقت کی جانب سے کی گئی دھاندلیوں کے خلاف احتجاجی مظاہروں نے ملک گیر تحریک کی صورت اختیار کر لی جو "تحریک نظامِ مصطفیٰ (ﷺ)" کے نام سے موسوم ہوئی اور دیکھتے ہی دیکھتے جنگل کی آگ کی طرح پورے ملک میں پھیل گئی۔ لہٰذا تنظیم کے اجتماع کو ملتوی کرنا پڑا ـــــ ۴ اور ۵ جولائی ۱۹۷۷ء کی درمیانی شب کو ملک میں مارشل لاء نافذ ہوا تو امن و امان کی صورتحال بحال ہوئی اور چونکہ کچھ اندازہ نہ تھا کہ تین ماہ بعد مارشل لاء کے اختتام پر ملک میں دوبارہ کیسے حالات پیدا ہو جائیں، لہٰذا بعض اہم رفقاء کے مشورے سے طے کر لیا گیا کہ پہلی فرصت میں تنظیم کا ایک اجتماع منعقد کر لیا جائے جو دوسرے اور تیسرے سالانہ اجتماعات کا قائم مقام ہو اور اس میں تنظیم کے مستقل نظام کے بارے میں حتمی فیصلہ کر لیا جائے۔

یہ اجتماع جو کچھ دو اجتماعات کے قائم مقام ہونے کے ناتے اور کچھ اہم موضوعات پر تفصیلی گفت و شنید اور بحث و تمحیص کی ضرورت کے پیشِ نظر پورے ایک ہفتے کے لئے طلب کیا گیا تھا۔ ۵ تا ۱۱/اگست ۱۹۷۷ء قرآن اکیڈمی ماڈل ٹاؤن لاہور میں جاری رہا۔ اور راقم نے حسبِ ذیل تین تنقیحات کے ذیل میں نہ صرف یہ کہ اپنے دینی فکر کو پوری وضاحت اور شرح و بسط کے ساتھ بیان کیا بلکہ جملہ شرکائے اجتماع کو بھی اظہارِ خیال اور اختلافِ رائے کا پورا موقع فراہم کیا:

۱۔ اقامتِ دین، شہادت علی الناس اور غلبہ و اظہارِ دین کی **سعی و جدوجہد** نفلی عبادت یا اضافی نیکی نہیں بلکہ از روئے قرآن و حدیث **بنیادی دینی فرائض** میں شامل ہے۔

۲۔ اس دینی فریضہ کی ادائیگی کے لئے **التزامِ جماعت** واجب ہے۔

۳۔ ایسی دینی جماعت کی ہیئتِ تنظیمی مغرب سے درآمد شدہ دستوری، قانونی اور جمہوری طرز کی نہیں بلکہ قرآن و سنت اور اسلاف کی روایات سے مطابقت رکھنے والے **بیعت** کے اصول پر مبنی ہونی چاہئے۔

الحمدللہ کہ ان تنقیحاتِ ثلاثہ پر پورے چھ دن سیر حاصل گفتگو ہوئی جس کے نتیجے میں شرکاءِ اجتماع کی غالب اکثریت نے راقم کے خیالات اور نظریات سے کامل اتفاق کیا اور بالآخر ناظم عمومی جناب شیخ جمیل الرحمٰن صاحب کی تحریک پر حسب ذیل قرارداد منظور ہو گئی:

تنظیم اسلامی کا یہ اجتماع عام حسبِ دفعہ ۳ دستور تنظیم اسلامی طے کرتا ہے کہ:

۱۔ آئندہ تنظیمِ اسلامی کا نظام مغرب سے درآمد شدہ دستوری قانونی اور جمہوری اُصولوں کے بجائے قرآن و سنت سے ماخوذ اور اسلاف کی روایات کے مطابق بیعت کے اصول پر مبنی ہو گا۔ چنانچہ تنظیمِ اسلامی کے داعیِ عمومی جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب آج کے بعد سے "امیرِ تنظیم اسلامی" ہوں گے۔ اور تنظیم میں داخلہ ان کے ساتھ اطاعت فی المعروف کی بیعت کا شخصی رابطہ استوار کرنے سے ہو گا اور وہ بحیثیت امیر تنظیم اسلامی اپنے فرائض "أَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ" اور "وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ" کی قرآنی ہدایات کے مطابق ادا کریں گے۔

۲۔ اس فیصلے سے لازم آتا ہے کہ:

(i) تنظیم اسلامی میں جو حضرات اب تک شریک رہے ہیں ان کی رفاقت آج سے ختم شمار ہو گی تآنکہ وہ اس قرارداد کے جزو اوّل کے مطابق بیعت کے نظام میں شامل ہو جائیں۔

(ii) تنظیم اسلامی کا موجودہ دستور بھی کالعدم متصور ہو گا اور امیر تنظیم اسلامی جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کو اختیار ہو گا کہ وہ جن رفقاء سے مناسب سمجھیں مشورہ کر

کے آئندہ کا دستور العمل طے کر لیں۔

۱۰ راگست ۱۹۷۷ء کو اس قرارداد کی منظوری اور اس پر جملہ شرکاء اجتماع کے دستخط ثبت ہونے پر گویا تنظیمِ اسلامی کا عبوری دور ختم اور نیا اور مستقل دور شروع ہو گیا۔ جو بحمد اللہ تا حال جاری ہے۔

اس عرصے کے دوران اگر کوئی خیر ذاتی طور پر راقم الحروف اور اجتماعی طور پر تنظیمِ اسلامی سے بن آیا ہے تو وہ محض اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم اور توفیق و تیسیر کا مظہر ہے ______ اور کوتاہیاں اور لغزشیں سرزد ہوئیں تو ہمارے اپنے نفوس کی شرارتوں کی بنا پر ______ چنانچہ آئندہ کے لئے اللہ تعالیٰ ہی سے دعا ہے کہ وہ اپنے خصوصی فضل و کرم سے نوازتے ہوئے ہدایت و استقامت میں اضافہ فرمائے اور شیطان کے فریب اور نفس کی شرارتوں سے اپنی حفاظت میں رکھے! رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ! آمین

تنظیمِ اسلامی کے لئے اُصولی طور پر ''بیعتِ سمع و طاعت فی المعروف'' کی تنظیمی اساس کو اختیار کر لینا تو مشکل نہ تھا لیکن موجودہ حالات میں اس بنیاد پر ایک جماعتی نظام کا ڈھانچہ بالفعل کھڑا کرنا ہرگز آسان نہ تھا۔ اس لئے کہ ایک جانب یہ تصور ''آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل'' کے مصداق ذہنوں سے بالکل خارج ہو چکا تھا، اور دوسری جانب ''بیعت'' کے ساتھ ایسے بہت سے عجیب و غریب تصورات لازم و ملزوم کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں جن سے موجودہ ذہن ہی نہیں خود فطرتِ انسانی ابا کرتی ہے ______ یہی وجہ ہے کہ ابتداء میں کچھ عرصے تک ہم خود بھی اس کے اظہار و اعلان میں ہچکچاہٹ محسوس کرتے رہے کہ دنیا کیا کہے گی ______ ع ''کہ اکبر نام لیتا ہے خدا کا اس زمانے میں!'' ______ بعد میں جب اس کا چرچا عام ہوا تو نہ صرف تمسخر اور استہزاء، بلکہ تردید اور مخالفت کا بازار بھی گرم ہوا ______ لیکن بحمد للہ اب جبکہ اس نظام کو بالفعل چلتے ہوئے چودہ برس ہونے کو آئے ہیں، اور نہ صرف اندرون ملک کثیر تعداد میں، بلکہ بیرون ملک حتیٰ کہ انگلستان اور امریکہ میں مقیم حضرات نے بھی معتدبہ تعداد میں اپنے فرائضِ دینی کی ادائیگی کے لئے بیعت کا قلادہ گردن میں ڈالنے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کی ہے، ہم اپنے دلوں میں گہرے تشکر آمیز اطمینان کا احساس موجزن پاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں ایک مردہ سنت کے احیاء کی توفیق عطا فرمائی ______ وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِيَ لَوْ لَا اَنْ هَدَانَا اللّٰهُ!!

بیرونی تمسخر اور مخالفت کو برداشت کرنے سے زیادہ کٹھن مرحلہ اُن غلط تصورات کے خاتمے کا تھا جو بیعت کے لفظ کے ساتھ لامحالہ وابستہ ہو گئے ہیں۔ جن میں سب سے زیادہ ناپسندیدہ اور مکروہ تصور یہ ہے کہ بیعت کے نظام میں نہ باہمی مشاورت کی کوئی گنجائش ہے نہ اختلافِ رائے اور اظہارِ خیال کا کوئی موقع! چنانچہ ہمیں اس غلط تصور کی نفی اور اس حقیقت کے اثبات میں بہت محنت بھی کرنی پڑی اور بہت سا وقت بھی صَرف کرنا پڑا کہ نظامِ بیعت میں اختلافِ رائے کی گنجائش 'اظہارِ خیال کے مواقع' اور باہمی مشاورت کا میدان نام نہاد جمہوری نظام سے بھی وسیع تر موجود ہے ______ اور فرق صرف اتنا ہے کہ جمہوری نظام میں آخری فیصلہ ع ''بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے!'' کے مصداق آراء کی گنتی کی بنیاد پر ہوتا ہے جبکہ نظامِ بیعت میں اظہارِ رائے اور کھلی بحث تمحیص کے بعد آخری فیصلہ صاحبِ امر کی صوابدید پر چھوڑ دیا جاتا ہے! گویا نظامِ بیعت میں اُصولِ قرآنی: ''اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ'' (الشوریٰ: ۳۸) کی بالفعل تعمیلِ حکم قرآنی: ''وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ'' (آل عمران: ۱۵۹) کے مطابق ہوتی ہے۔

دوسری جانب اس تصور کا خاتمہ بھی ہرگز آسان نہ تھا کہ مشاورت باہمی کا لازمی اور منطقی نتیجہ یہ ہے کہ اکثریت کی رائے کو فیصلہ کُن قرار دیا جائے، اس لئے کہ عہدِ حاضر میں ''سلطانیٔ جمہور'' کا تصور نہ صرف یہ کہ حد درجہ عالمگیر ہو چکا ہے بلکہ لوگوں کے شعور ہی نہیں تحت الشعور کی گہرائیوں میں اس حد تک سرایت کر چکا ہے، کہ بسا اوقات بیعت کے نظام کو اصولاً تسلیم اور اختیار کر لینے کے بعد بھی اس پر اصرار برقرار رہتا ہے کہ امیر کو شوریٰ کی اکثریت کے فیصلے کا ''پابند'' ہونا چاہئے۔

الغرض تنظیمِ اسلامی کے لئے بیعت کا نظام اُصولی طور پر تو ۱۹۷۷ء میں اختیار کر لیا گیا تھا، اور اس کے بعد عملاً تنظیم کی گاڑی اسی پٹڑی پر چل رہی ہے، تاہم اس کے مضمرات اور متضمنات کے واضح ہونے اور اسی کی بنیاد پر ایک جماعت نظام کی تفصیلی تشکیل اور اس کے خدوخال کے صفحۂ قرطاس پر مرتسم ہونے میں کم و بیش دس سال کی مدت صرف ہوئی۔ اور نہ صرف اصولی غور و خوض بلکہ دس سالہ تجربات کی روشنی میں تنظیمِ اسلامی کے لئے ایک تحریری ''نظام العمل'' کی تسوید و تبییض کا مرحلہ اوائل ۱۹۸۸ء میں شروع ہو سکا۔ جبکہ تنظیم کی مرکزی مجلسِ مشاورت نے اپنے اجلاس منعقدہ ۲، ۳ مارچ ۱۹۸۸ء میں باضابطہ طے کیا کہ:

> ''تنظیمِ اسلامی میں شمولیت کے لئے بیعت کی اساس اگرچہ دس سال قبل اختیار کر لی گئی تھی لیکن فی زمانہ کسی ہیئتِ اجتماعیہ کے لئے اس مسنون اساس کے متروک العمل ہونے کے باعث تنظیمِ اسلامی کو بھی اس کے عملی تقاضوں سے کامل ہم آہنگی کے ضمن میں تدریجی مراحل سے گزرنا پڑا ہے۔ اسی ضمن میں اگرچہ متعدد فیصلے مختلف اوقات میں کئے جاتے رہے ہیں لیکن ان کو باضابطہ ضبطِ تحریر میں نہیں لایا گیا۔ اسی طرح اگرچہ تنظیم کی قراردادِ تاسیس اور اس کی توضیحات میں بعض تاریخی اسباب کی بنا پر فریضۂ اقامتِ دین کی اہمیت اور اس کے لئے جہاد فی سبیل اللہ کے لزوم کے قدرے خفی اور غیر نمایاں ہونے کے پیشِ نظر تنظیم کے آٹھویں سالانہ اجتماع میں یہ اعلان کر

دیا گیا تھا کہ آئندہ تنظیم اسلامی محض اصلاحی اور دعوتی نہیں بلکہ انقلابی تنظیم ہوگی۔تاہم ابھی تک یہ بات بھی پوری وضاحت کے ساتھ تحریری طور پر سامنے نہیں آئی۔لہٰذا ضروری ہے کہ ان دونوں اُمور کو مجوزہ نظام العمل میں صراحت کے ساتھ درج کر دیا جائے اور جیسے کہ پانچ سال قبل طے کیا گیا تھا تنظیمِ اسلامی کی قراردادِ تاسیس مع توضیحات اور ''شرائطِ شمولیت'' پر مشتمل مفصل تحریر کو آئندہ تنظیم کی آئینی و دستوری اساس نہیں بلکہ اس کے دعوتی اور تربیتی لٹریچر کا اہم اور اساسی حصہ سمجھا جائے۔''

الحمد للہ کہ اندریں اثناء تنظیم کا تفصیلی ''نظام العمل'' تیار ہو کر ''سلسلۂ اشاعتِ تنظیمِ اسلامی نمبر۴'' کی حیثیت سے شائع ہو رہا ہے۔جبکہ پیشِ نظر کتاب تنظیم کے اساسی نظریات کی وضاحت پر مشتمل ہونے کے ناتے اس کے دعوتی اور تربیتی لٹریچر کا اہم حصہ ہے۔

اس کتاب کے تیسرے اور مختصر ترین حصے میں ''فرائضِ دینی کا جامع تصور'' مختصر ترین الفاظ میں بیان ہوا ہے ___ یہ راقم الحروف کے عمر بھر کے مطالعۂ قرآن و حدیث اور سنت و سیرتِ رسول (ﷺ) کے خلاصے اور لب لباب کی حیثیت رکھتا ہے اور اس اعتبار سے بلاشبہ تنظیم کے اساسی دینی فکر کا جزوِ لاینفک ہے۔

راقم نے اپنے تصورات کے سلسلے میں علماء کرام سے استصواب اور اُن کی آراء سے رفقاءِ تنظیم کو براہ راست آگاہ کرنے کے لئے یہ اہتمام کیا کہ ۱۹۸۵ء کو تنظیم کا سالانہ اجتماع بھی ۲۳ تا ۲۸ مارچ مسلسل چھ دن جاری رہا۔اور انہی ایام میں مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے سالانہ محاضراتِ قرآنی بھی منعقد کر لئے گئے۔چنانچہ جامع القرآن، قرآن اکیڈمی ماڈل ٹاؤن لاہور میں صبح کے اوقات میں تنظیم کے سالانہ اجتماع کی کارروائی جاری رہتی تھی اور شام کو تین ساڑھے تین گھنٹے کا اجلاس محاضرات کا ہوتا تھا۔جن کا موضوع میری یہی تحریر تھی جس پر تقریباً یک صد علماء کو اظہارِ خیال کی دعوت دی گئی تھی ____ جن میں سے پچیس حضرات نے باضابطہ شرکت فرما کر بالمشافہ خطاب فرمایا اور تقریباً اتنے ہی حضرات نے اپنی آراء تحریری صورت میں ارسال کر دیں۔چنانچہ روزانہ اوسطاً چار حضرات کا خطاب ہوا جن میں سے بعض نے میرے خیالات کی کامل تصویب فرمائی، بعض نے جزوی اتفاق کا اظہار فرمایا بعض نے شدید تنقید کی، یہاں تک کہ بعض نے فقرے بھی چست کئے اور مذاق اُڑایا ____ الحمد للہ کہ تنظیم کے لگ بھگ ساڑھے تین سو رفقاء نے جملہ تقاریر کو پورے سکون و اطمینان اور کامل توجہ و انہماک کے ساتھ سنا۔جس سے بحمد اللہ اُن کے اعتماد ہی میں اضافہ ہوا ____ اور کسی ایک کے دل میں بھی فرائضِ دینی کے اس جامع تصور کے بارے میں کوئی اشتباہ پیدا نہ ہوا۔

ذاتی طور پر راقم کو ان محاضرات سے دو فائدے حاصل ہوئے، ایک تو رواروی میں لکھی ہوئی عبارت میں بعض الفاظ کے بے محل استعمال سے جو مغالطے پیدا ہوئے اُن کی اصلاح کی صورت پیدا ہوگئی۔اور دوسرے یہ کہ راقم کو اپنے فکر کی مجموعی تصویب مولانا سعید احمد اکبر آبادیؒ، مولانا مفتی سیاح الدین کاکاخیلؒ، مولانا سید عنایت اللہ شاہ بخاری، مولانا سید مظفر حسین ندوی اور ڈاکٹر بشیر احمد صدیقی ایسے اصحاب علم و فضل سے حاصل ہوئی ____ جس سے ؎ ''متفق گردید رائے بوعلی با رائے من!'' کے مصداق خود راقم کے اعتماد میں اضافہ ہوا۔فجزاھم اللّٰہ عنّی و عن جمیع رفقاء التنظیمِ خیر الجزاء۔ اٰمین

اسرار احمد

تنظیم اسلامی
کی اساسی دعوت

تجدید ایمان	توبہ	تجدید عہد

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِيْ نَزَّلَ عَلٰي رَسُوْلِهٖ

(النساء:۱۳۶)

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا تُوْبُوْٓا اِلَى اللّٰهِ تَوْبَةً نَّصُوْحًا

(التحریم:۸)

وَاذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيْثَاقَهُ الَّذِيْ وَاثَقَكُمْ بِهٖٓ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا

(المائدہ:۷)

وَاَوْفُوْا بِعَهْدِيْٓ اُوْفِ بِعَهْدِكُمْ وَاِيَّايَ فَارْهَبُوْنِ

(البقرہ:۴۰)

حصۂ اوّل

○

قراردادِ تاسیس

مع

توضیحات

(منظور شدہ اجتماعِ رحیم یار خان ۸۔۹ ستمبر ۱۹۶۷ء)

اور

تقاریر مولانا امین احسن اصلاحی و مولانا عبد الغفار حسن

و

تقاریظ مولانا عبد الماجد دریابادیؒ و مولانا عبد الباری ندویؒ

(شائع شدہ ’میثاق‘ نومبر، دسمبر ۱۹۶۷ء)

قراردادِ تاسیس

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

’’آج ہم اللہ کا نام لے کر ایک ایسی اسلامی تنظیم کے قیام کا فیصلہ کرتے ہیں جو دین کی جانب سے عائد کردہ جُملہ انفرادی واجتماعی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے میں ہماری ممدّ ومعاون ہو۔

ہمارے نزدیک دین کا اصل مخاطب فرد ہے۔ اُسی کی اخلاقی وروحانی تکمیل اور فلاح ونجات، دین کا اصل موضوع ہے، اور پیشِ نظر اجتماعیت اصلاً اسی لئے مطلوب ہے کہ وہ فرد کو اس کے نصب العین یعنی رضائے الٰہی کے حصول میں مدد دے۔

لہٰذا پیشِ نظر اجتماعیت کی نوعیت ایسی ہونی چاہئے کہ اُس میں فرد کی دینی اور اخلاقی تربیت کا کماحقہٗ لحاظ رکھا جائے اور اس امر کا خصوصی اہتمام کیا جائے کہ اس کے تمام شرکاء کے دینی جذبات کو جِلا حاصل ہو، ان کے علم میں مسلسل اضافہ ہوتا رہے، ان کے عقائد کی تصحیح وتطہیر ہو، عبادت اور اتباعِ سنت سے اُن کا شغف اور ذوق وشوق بڑھتا چلا جائے، عملی زندگی میں حلال وحرام کے بارے میں اُن کی حِس تیز تر اور اُن کا عمل زیادہ سے زیادہ مبنی بر تقویٰ ہوتا چلا جائے اور دین کی دعوت واشاعت اور اس کی نُصرت واقامت کے لئے اُن کا جذبہ ترقی کرتا چلا جائے۔ اِن تمام اُمور کے لئے ذہنی اور علمی رہنمائی کے ساتھ ساتھ عملی تربیت اور تاثیرِ صحبت کے اہتمام کی جانب خصوصی توجہ ناگزیر ہے۔

دعوتِ دین کے ضمن میں ہمارے نزدیک ’’الدِّینُ النَّصِیحۃُ‘‘ کی روح اور ’’الاقرب فالاقرب‘‘ کی تدریج ضروری ہے۔ لہٰذا دعوت واصلاح کے عمل کو فرد سے اوّلاً کنبہ اور خاندان اور پھر تدریجاً ماحول کی جانب بڑھانا چاہئے۔ اس ضمن میں نئی نسل کی دینی تعلیم وتربیت کا خصوصی اہتمام ناگزیر ہے۔

عامۃُ النّاس کو دین کی دعوت وتبلیغ کی جو ذمہ داری امتِ مسلمہ پر بحیثیت مجموعی عائد ہوتی ہے، اس کے ضمن میں ہمارے نزدیک اہم ترین کام یہ ہے کہ جاہلیتِ قدیمہ کے باطل عقائد ورسوم اور دورِ جدید کے گمراہ کن افکار ونظریات کا مدلّل ابطال کیا جائے اور حیاتِ انسانی کے مختلف پہلوؤں کے لئے کتاب وسنت کی ہدایت ورہنمائی کو وضاحت کے ساتھ پیش کیا جائے، تاکہ ان کی اصلی حکمت اور عقلی قدر وقیمت واضح ہو اور وہ شبہات وشکوک رفع ہوں جو اس دَور کے لوگوں کے ذہنوں میں موجود ہیں۔‘‘

توضیحات

قرارداد میں جن اُمور کی وضاحت کی گئی ہے ان میں اوّلین اور اہم ترین امر یہ ہے کہ ''ہمارے نزدیک دین کا اصل مخاطب فرد ہے۔ اسی کی اخلاقی اور روحانی تکمیل اور فلاح و نجات، دین کا اصل موضوع ہے اور پیشِ نظر اجتماعیت اصلاً اسی لئے مطلوب ہے کہ وہ فرد کو اس کے اصل نصب العین یعنی رضائے الٰہی کے حصول میں مدد دے!'' ____ اس تصریح کی ضرورت اس لئے محسوس ہوئی کہ ماضی میں مسلمانوں کو ان کی یہ ذمہ داری تو بالکل ٹھیک یاد کرائی گئی کہ جس دین کے وہ مدعی ہیں اسے دنیا میں عملاً قائم کرنے کی سعی و جہد بھی ان پر فرض ہے اور یہ کہ دین محض ذاتی عقائد اور کچھ مراسمِ عبودیت یعنی انسان اور رب کے مابین پرائیویٹ تعلق کا نام نہیں ہے بلکہ وہ انسان کی پوری انفرادی و اجتماعی زندگی کو اپنے احاطے میں لینا چاہتا ہے لیکن ان اُمور پر اس قدر زور دیا گیا کہ بندے اور رب کے مابین تعلق کی اہمیت اور افراد کی اپنی علمی، اخلاقی اور رُوحانی ترقی نظر انداز ہوتی چلی گئی۔ آئندہ جو کام پیشِ نظر ہے اُس کے اُصول و مُبادی میں یہ نکتہ بہت زیادہ قابلِ لحاظ رہے گا کہ ایک مسلمان کا اصل نصب العین صرف نجاتِ اُخروی اور رضائے الٰہی کا حصول ہے اور اس کے لئے اسے اصل زور اپنی سیرت کے تطہیر و تزکیے اور اپنی شخصیت کی تعمیر و تکمیل پر دینا ہوگا جس سے تعلق مع اللہ اور محبت خدا اور رسول ﷺ میں اضافہ ہوتا رہے اور اس میں زیادہ سے زیادہ اخلاص پیدا ہوتا چلا جائے۔ دین کی تائید و نصرت اور شہادت و اقامت یقیناً فرائضِ دینی میں سے ہیں لیکن ان کے لئے کوئی ایسی اجتماعی جدوجہد ہرگز جائز نہیں ہے جو افراد کو ان کے اصل نصب العین سے غافل کر کے انہیں محض ایک دُنیوی انقلاب کے کارکن بنا کے رکھ دے! ____ چنانچہ پیشِ نظر اجتماعیت میں اوّلین زور افراد کی دینی و اخلاقی تربیت پر دیا جائے گا اور اس امر کا خصوصی اہتمام کیا جائے گا کہ ____ ''اس کے تمام شرکاء کے دینی جذبات کو جِلا حاصل ہو، ان کے علم میں مسلسل اضافہ ہوتا رہے، ان کے عقائد کی تصحیح و تطہیر ہو، عبادات اور اتباعِ سنت سے ان کا شغف اور ذوق و شوق بڑھتا چلا جائے، عملی زندگی میں حلال و حرام کے بارے میں ان کی حِس تیز تر اور ان کا عمل زیادہ سے زیادہ مبنی بر تقویٰ ہوتا چلا جائے اور دین کی دعوت و اشاعت اور اس کی نصرت و اقامت کے لئے ان کا جذبہ ترقی کرتا چلا جائے۔''

''دینی جذبات کے جِلا'' کے لئے قرآن مجید کی بلا ناغہ تلاوت مع تدبر، سیرتِ نبویؐ اور سیَر الصحابہؓ کا مطالعہ، مجالسِ وعظ کا انعقاد، باہمی مذاکرۂ آخرت اور مضامینِ موعظت پر مشتمل آسان لٹریچر کی اشاعت پر زور دیا جائے گا۔

''علم میں اضافے'' کے لئے عربی زبان کی تحصیل کی عام ترغیب اور اس کا اہتمام قرآنِ حکیم اور حدیثِ نبویؐ کے باقاعدہ حلقہ ہائے درس کا قیام اور جاہلیتِ قدیمہ و جدیدہ پر اسلام کے نقطۂ نظر سے تنقیدی کتب کی نشر و اشاعت کا اہتمام کیا جائے گا۔

مندرجہ بالا دونوں اُمور سے یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ جاہلیتِ قدیم و جدید دونوں کے اثرات قلوب و اذہان سے محو ہوں، عقائد کی تصحیح و تطہیر ہو اور صحیح اسلامی عقائد کی تخم ریزی و آبیاری ہو سکے۔

شرکائے تنظیم کے دینی جذبات کے جِلا اور علم میں اضافے کا براہِ راست اثر عملی زندگی پر پڑے گا اور ان کی زندگیوں میں دینی تبدیلی عملاً پیدا ہوتی چلی جائے گی لیکن اس میدان میں اس امر کی شدید ضرورت ہوگی کہ اس بات کی کڑی نگرانی کی جائے کہ یہ تبدیلی ہمہ جہتی ہو اور اعمالِ انسانی کے مختلف گوشوں میں متناسب انداز میں ظہور پذیر ہو۔ چنانچہ عبادات میں ذوق و شوق، معاملات میں احتیاط و تقویٰ اور دعوتی و تنظیمی سرگرمیوں میں شغف اور دلچسپی متناسب انداز میں بڑھے۔ یہ صورتِ حال کہ جلسوں کے انعقاد کے ضمن میں تو پابندی بھی ملحوظ رہے اور جوش و خروش کا بھی مظاہرہ کیا جائے لیکن نماز باجماعت کی پابندی گراں محسوس ہو اور نوافل سرے سے خارج از بحث ہو جائیں، دین کی نصرت و حمایت کا جذبہ تو ترقی کرتا چلا جائے لیکن تزکیۂ باطن کی طرف کوئی توجہ نہ دی جائے، یا سنتِ نبویؐ کی حجیت و اہمیت پر دلائل تو از بر ہوں لیکن خود اپنی زندگی میں اتباعِ نبویؐ کی جھلک نظر نہ آئے، نہ صرف یہ کہ افراد کے حق میں سمِ قاتل ہے بلکہ خود اجتماعیت کے لئے بھی سخت مُضر اور مہلک ہے ____ لہٰذا اس امر کی کڑی نگرانی ضروری ہوگی کہ شرکاء میں عبادات سے شغف، اتباعِ سنت کا جذبہ، معاملات میں حلال و حرام کی حدود و قیود کی پابندی اور دعوتی و تنظیمی سرگرمیوں سے دلچسپی توافق و تناسب کے ساتھ بڑھیں۔ خصوصاً یہ احتیاط تو انتہائی لازمی ہوگی کہ پیشِ نظر اجتماعیت کے تنظیمی ڈھانچے میں جو لوگ آگے آئیں وہ تیزی و مستعدی اور نفاست و باقاعدگی سے کام کرنے کی صلاحیت کے اعتبار سے چاہے کسی قدر تہی دست ہوں، عبادات اور اتباعِ سنت کے ذوق و شوق سے ہرگز تہی دامن نہ ہوں۔

شرکائے جماعت میں مندرجہ بالا تبدیلیوں ____ یا بالفاظ دیگر ان کے نفوس کے تزکیہ اور ان کی شخصیت کی دینی تعمیر کے لئے جہاں ذہنی و علمی رہنمائی اور فکری تربیت لازمی و لابدی ہیں وہاں عملی تربیت اور تاثیرِ صحبت کا موثر اہتمام بھی ضروری و ناگزیر ہے۔ اس غرض کے لئے مختلف مقامات پر تربیت گاہوں کا سلسلہ بھی شروع کیا جا سکتا ہے اور ایک ایسی مرکزی تربیت گاہ کا قیام بھی عمل میں لایا جا سکتا ہے جس میں مختلف مقامات کے رفقاء گروپس (GROUPS) کی صورت میں شریک ہوں اور ایک مقررہ میعاد میں انہیں قرآن و حدیث کے منتخب حصص کا درس بھی دیا جائے اور ایک ایسی دینی فضا بھی مہیا کی جائے جس میں ان

کے دینی جذبات بھی ازسرِنو تروتازہ ہوں اور ایک خالص اسلامی زندگی بسر کرنے کا عملی تجربہ بھی حاصل ہو جائے۔

قرارداد کے بنیادی نکات میں سے دوسرا اہم اور بنیادی نکتہ یہ ہے کہ ___ ''دعوت کے ضمن میں ہمارے نزدیک ''الدین النصیحۃ'' کی روح اور ''الاقرب فالاقرب'' کی تدریج ضروری ہے۔'' پیشِ نظر اجتماعیت لازماً یہ چاہے گی کہ اس کا ہر شریک نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع میں داعی الی اللہ اور اپنے ماحول میں حسب مقدور وصلاحیت اور بقدر ہمت واستطاعت ہدایت کا ایک روشن چراغ بن کر رہے اور اس کی شخصیت پر بحیثیت مجموعی داعیانہ رنگ غالب ہو جائے۔

اس دعوت کا اصل محرک ابنائے نوع کی ہمدردی اور نصح وخیر خواہی کا جذبہ ہونا چاہئے اور اس میں نہ تو اپنی شخصیت کی نمود کا کوئی شائبہ شامل ہونا چاہئے نہ طلب جاہ کا۔ حتیٰ کہ اللہ، رسولؐ اور شریعت کی وفاداری کے جذبے کے تحت اگر کبھی کسی فرد، گروہ یا ادارے پر تنقید کی نوبت آجائے تو اس میں بھی ہمدردی اور دلسوزی غالب رہے اور ذاتی رنجش یا انتقامِ نفس کا کوئی شائبہ نہ پیدا ہونے پائے۔

اس سلسلے میں یہ وضاحت بہت ضروری ہے کہ _____ ہمارے معاشرے کا مجموعی مزاج اگرچہ دین سے بہت دور جا چکا ہے اور اس اعتبار سے انتہائی اصلاح طلب ہے لیکن دعوت واصلاح کے عمل میں دو حقائق کا لحاظ ضروری ہے۔ ایک یہ کہ یہ معاشرہ ایک مجموعی اکائی ہے اور اس کے تمام طبقات میں انحطاط سرایت کر چکا ہے۔ اس اعتبار سے اس کے مختلف طبقات میں کمیت کا تھوڑا بہت فرق چاہے موجود ہو کوئی بنیادی امتیاز موجود نہیں ہے اور دوسرے یہ کہ انحطاط براہِ راست نتیجہ ہے جذباتِ ایمانی کے ضعف اور کتاب وسنت کے علم کی کمی کا۔ اس میں دین دشمنی کا عنصر چند ایسی استثنائی صورتوں کے سوا موجود نہیں ہے جو اگرچہ بجائے خود تو بہت خطرناک ہیں اور ان سے خبردار رہنے کی بھی ضرورت ہے تاہم مجموعی اعتبار سے ہمارے معاشرے کے عام بگاڑ کا اصل سبب دین دشمنی نہیں بلکہ دین سے لاعلمی ہے۔ حکومت اس معاشرے کا جامع عکس اور اربابِ اقتدار اس کا اہم جزو ہیں۔ اُن کو اپنی اہمیت اور معاشرے میں اثر ونفوذ کی قوت وصلاحیت کے اعتبار سے دعوت و تخاطب میں اولیت تو دی جاسکتی ہے اور دی جانی چاہئے لیکن انہیں دین کا دشمن قرار دے کر ان کے خلاف نفرت وعداوت کے جذبات پیدا کرنے کے لئے عوام کے دینی جذبے کو مشتعل کرنا درآں حالیکہ خود عوام کی ایک عظیم اکثریت کا حال دین سے بے خبری اور عملی بُعد کے اعتبار سے خود کم وبیش وہی ہے جو اصحابِ قوت و اختیار کا، نہ ان کی خیر خواہی ہے نہ خود دین کی۔ رہا اقتدار کے حصول کی خاطر برسرِ اقتدار طبقے کے مخالف ومعاند کی حیثیت اختیار کرنا تو یہ ہمارے نزدیک دینی نقطۂ نظر سے نہایت مضر ہی نہیں سخت مہلک ہے جس سے کُلّی اجتناب لازمی ولابدی ہے۔ ہمارے نزدیک ''اَئِمَّةُ الْمُسْلِمِین'' اور ''عامّتھم'' دونوں ہی نصح و خیر خواہی کے برابر مستحق اور دعوت واصلاح کے یکساں محتاج ہیں!

یہاں یہ تصریح بھی ضروری ہے کہ ہماری دانست میں انتخابات کے ذریعے عمومی اصلاح کا نظریہ نری خام خیالی پر مبنی ہے، بحالاتِ موجودہ تو اس امر کا سرے سے کوئی امکان ہی نہیں ہے کہ انتخابات کے ذریعے اصلاح کی اُمید کی جائے۔ ویسے بھی ہماری رائے میں انتخابات میں دوسری جماعتوں کے مخالف ومقابل کی حیثیت سے شرکت، دعوت واصلاح کے صحیح نہج کے منافی ہے اور اس سے قبولِ حق کے دروازے بند ہو جاتے ہیں۔

داعی کے قلب میں اپنے ابنائے نوع کے لئے جس ہمدردی اور نصح وخیر خواہی کا ہونا لازمی ہے، اسی کا ایک اہم مظہر رافت ورحمت اور شفقت ورقت کا وہ جذبہ ہے جو ابنائے نوع کو تکلیف اور مصیبت میں دیکھ کر اس کے دل میں پیدا ہوتا ہے اور عملی زندگی میں خدمتِ خلق اور ایثار وانفاق کی صورت میں جلوہ گر ہوتا ہے۔ دعوت دین اور خدمت خلق کا ایسا چولی دامن کا ساتھ ہے کہ ایک کو دوسرے سے علیحدہ کرنا ممکن نہیں بلکہ بلا خوف تردید یہ کہا جاسکتا ہے کہ دین کا وہ داعی جو خادمِ خلق نہ ہو اپنی دعوت میں دولت اخلاص سے محروم ہے۔ اس ضمن میں یہ فرق البتہ ضرور پیشِ نظر رہنا چاہئے کہ خدمت خلق کی اجتماعی سکیموں کا زیرِ عمل لانا بالکل دوسری بات ہے اور افراد میں خدمت خلق کے جذبے کا پیدا ہونا اور بڑھنا بالکل دوسری چیز ہے۔ خدمت خلق کی اجتماعی سکیموں کی اہمیت اپنی جگہ کتنی ہی مسلم ہو، دعوت دین کے نقطۂ نظر سے اصل مطلوب افراد کے قلوب میں شفقت ورحمت کے جذبے اور عمل میں ایثار وانفاق کی کیفیت کا ظہور ہے۔ پیشِ نظر اجتماعیت میں اصل زور ان شاءاللہ اسی پر دیا جائے گا۔

دعوت کے ضمن میں دوسری اہم بات یہ ہے کہ اس کا تخاطب لازماً ایک تدریج کے ساتھ داعی کے اپنے نفس سے شروع ہو کر ﴿عَلَيْكُمْ اَنْفُسَكُمْ لَا يَضُرُّكُمْ مَّنْ ضَلَّ اِذَا اهْتَدَيْتُمْ﴾ اپنے اہل وعیال ﴿قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَ اَهْلِيْكُمْ نَارًا﴾ اور کنبے قبیلے ﴿وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ﴾ سے ہوتے ہوئے اپنی قوم ﴿يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ﴾ اور پھر پوری انسانیت ﴿لِتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ﴾ تک پہنچنا چاہئے۔ ہمارے نزدیک یہ صورت کہ داعی اپنے آپ کو بھول جائے اور برّ وتقویٰ کی ساری دعوت دوسروں کو دیتا رہے۔ ﴿اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ﴾ یا اپنے خاندان اور کنبے قبیلے کو تو بھول جائے اور دور دراز کے لوگوں میں ہدایت کی سوغات بانٹنے کے لئے اُٹھ کھڑا ہو، نہایت خطرناک مرض کی علامت ہے، دعوت کے عمل کا صحیح نہج یہ ہے کہ اَلْاَقْرَبُ فَالْاَقْرَبُ کے اصول پر آگے بڑھے اور جس سے جتنی قربت اور محبت داعی کو ہو دعوت وتخاطب

میں اسی قدر اسے مقدم رکھا جائے۔ اس سلسلے میں یہ خیال البتہ صحیح نہ ہوگا کہ ایک مرحلے کی تکمیل کے بعد ہی دوسرا مرحلہ شروع کیا جائے۔ مطلوب صرف یہ ہے کہ دعوت کے عمل کو ایک فطری تدریج اور حسین تناسب کے ساتھ اپنی ذات، اہل وعیال، کنبے قبیلے اور پھر عوام الناس تک بڑھنا چاہیئے۔

اس سلسلے میں ہمیں اپنی اولاد اور فی الجملہ نئی نسل کے بارے میں خصوصی توجہ واہتمام سے کام لینا ہوگا، اس لئے کہ ان کے بارے میں ہم حدیث نبویؐ (كُلُّكُمْ رَاعٍ وَّكُلُّكُمْ مَّسْئُوْلٌ عَنْ رَّعِيَّتِهٖ) ....(الخ) کی رو سے براہِ راست مسئول اور ذمہ دار ہیں۔ اولاد کی دینی تعلیم وتربیت کا یہ اہتمام ذاتی وانفرادی بھی ہوگا اور جہاں جہاں ممکن ہوگا اور وسائل دستیاب ہوسکیں گے اس امر کی سعی بھی کی جائے گی کہ ایسے مدارس اپنے اہتمام میں قائم کئے جائیں جن میں نئی نسل کے قلوب واذہان میں ایمان کی تخم ریزی وآبیاری اور اخلاقی وعملی تربیت کا بندوبست کیا جائے۔

وسائل دعوت کے ضمن میں کوئی تعین غیر ضروری ہے۔ حسب صلاحیت واستعداد انفرادی ونجی گفتگو، خطاب ہائے عام، خطاب جمعہ اور دروس قرآن وحدیث کے ساتھ ساتھ تصنیف وتالیف اور نشر واشاعت کے تمام جدید طریقوں کو اختیار کیا جاسکتا ہے!

قرارداد کا تیسرا اہم نکتہ ''عامۃ الناس کو دین کی دعوت وتبلیغ'' کی اس ذمہ داری سے بحث کرتا ہے جو ''امتِ مسلمہ پر بحیثیتِ مجموعی عائد ہوتی ہے'' ہمارے نزدیک انذار وتبشیر، دعوت وتبلیغ اور شہادتِ حق علی الناس کی جو ذمہ داریاں انبیائے کرام علیہم السلام پر عائد ہوا کرتی تھیں، وہ اب حضور نبی کریم ﷺ پر نبوت ورسالت کے ختم ہوجانے کے بعد آپ کی اُمت پر بحیثیتِ مجموعی عائد ہوتی ہیں۔ اوّل اوّل اُمت نے ''خلافت علیٰ منہاج النبوۃ'' کے نظام کے تحت اپنی اس ذمہ داری کو اجتماعی حیثیت سے ادا کیا، اس کے خاتمے کے بعد بھی ایک عرصے تک مسلمان حکومتیں اِس فرضِ منصبی کو ادا کرتی رہیں۔ اس کے بعد ایک طویل عرصے تک اتقیاء وصلحاء ذاتی طور پر دُور دراز علاقوں میں پہنچ کر دین کی دعوت وتبلیغ کا فریضہ ادا کرتے رہے۔ ادھر عرصے سے یہ سلسلہ بھی تقریباً ختم ہوچکا ہے اور اُمتِ مسلمہ بحیثیتِ مجموعی ''کتمانِ حق'' کے جرم کی مرتکب ہورہی ہے اور صورتِ حال یہ ہے کہ اُمت کی تمام اجتماعی سرگرمیاں صرف اپنے دفاع اور دنیوی ترقی واستحکام تک محدود ہیں۔ کچھ تھوڑا بہت دینی رنگ کسی اجتماعی سرگرمی میں ہے بھی تو وہ محض اُمّت کی داخلی اصلاح کی حد تک ہے۔ ہمارے نزدیک یہ صورتِ حال سخت تشویشناک ہے اور اس سے نہ صرف یہ کہ اُخروی بازپُرس کا اندیشہ ہے، بلکہ ہماری رائے میں ہماری دنیوی نکبت وذلّت کا اصل سبب بھی یہی ہے!

اس ضمن میں ہمارے نزدیک اس وقت کرنے کا اہم ترین کام یہ ہے کہ ایک طرف ادیانِ باطلہ کے مزعومہ عقائد کا مؤثر ومدلل ابطال کیا جائے اور دوسری طرف مغربی فلسفہ وفکر اور اس کے لائے ہوئے زندقہ والحاد اور مادہ پرستی کے سیلاب کا رُخ موڑنے کی کوشش کی جائے اور حکمتِ قرآنی کی روشنی میں ایک ایسی زبردست جوابی علمی تحریک برپا کی جائے اور حکمتِ قرآنی کی روشنی میں ایک ایسی زبردست جوابی علمی تحریک برپا کی جائے جو توحید، معاد اور رسالت کے بنیادی حقائق کی حقانیت کو بھی مبرہن کردے اور انسانی زندگی کے لئے دین کی رہنمائی وہدایت کو بھی مدلل ومفصل واضح کردے۔ ہمارے نزدیک اسلام کے حلقے میں نئی اقوام کا داخلہ، اور جسدِ دین میں نئے خون کی پیدائش ہی نہیں، خود اسلام کے موجود الوقت حلقہ بگوشوں میں حرارتِ ایمانی کی تازگی اور دین وشریعت کی عملی پابندی اسی کام کے ایک موثر حد تک تکمیل پذیر ہونے پر موقوف ہے، اس لئے کہ دورِ جدید کے گمراہ کن افکار ونظریات کے سیلاب میں خود مسلمانوں کے ذہین اور تعلیم یافتہ طبقے کی ایک بڑی تعداد اس طرح بہہ نکلی ہے کہ ان کا ایمان بالکل بے جان اور دین سے ان کا تعلق محض برائے نام رہ گیا ہے اور اسی بنا پر دین میں نت نئے فتنے اُٹھ رہے ہیں اور ضلالت وگمراہی نت نئی صورتوں میں ظہور پذیر ہو رہی ہے۔

اس سلسلے میں انفرادی کوششیں تو اب بھی جیسی کچھ بھی عملاً ممکن ہیں جاری ہیں اور آئندہ بھی جاری رہیں گی۔ ضرورت اس کی داعی ہے جیسے بھی ممکن ہو وسائل فراہم کئے جائیں اور ایک ایسے باقاعدہ ادارے کا قیام عمل میں لایا جائے جو حکمتِ قرآنی اور علمِ دینی کی نشر واشاعت کا کام بھی کرے اور ایسے نوجوانوں کی تعلیم وتربیت کا بھی مناسب اور مؤثر بندوبست کرے جو عربی زبان، قرآن حکیم اور شریعتِ اسلامی کا گہرا علم حاصل کرکے اسلامی اعتقادات کی حقانیت کو بھی ثابت کریں اور انسانی زندگی کے مختلف شعبوں کے لئے جو ہدایات اسلام نے دی ہیں انہیں بھی ایسے انداز میں پیش کریں جو موجودہ اذہان کو اپیل کرسکے۔

آخر میں اس امر کی وضاحت بہت ضروری ہے کہ پیشِ نظر تنظیم ہرگز ''الجماعت'' کے حکم میں نہ ہوگی۔ الجماعۃ کا مقام ہماری دانست میں اُمتِ مسلمہ کو بحیثیتِ مجموعی حاصل ہے۔ پیشِ نظر اجتماعیت کی حیثیت مسلمانوں کی ایک ایسی تنظیم کی ہوگی جس میں وہ لوگ شریک ہوں گے جو خود اصلاحِ نفس اور تعمیرِ سیرت کے خواہش مند ہوں اور ان جملہ انفرادی واجتماعی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونا چاہیں جو دین کی جانب سے ان پر عائد ہوتی ہیں تاکہ ایک طرف اُن کا باہمی تعاون ایک دوسرے کے لئے سہارا بن سکے اور دوسری طرف اصلاحِ معاشرہ کے لئے ایک مؤثر قوت فراہم ہوجائے ______ دین کی خدمت نہایت وسیع وعظیم کام ہے اور اس کے گوشے بے شمار ہیں۔ ہم ان تمام جماعتوں اور اداروں کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں جو کسی بھی گوشے میں دین کی خدمت کا کام کر رہے ہیں اور ان شاء اللہ ان کے ساتھ ہمارا رویہ تعاون وتائید ہی کا ہو

گا ____ اپنے فہم وفکر کے مطابق ہم بھی دین کی خدمت کی ایک ادنیٰ کوشش کے لئے جمع ہو رہے ہیں اور یہ توقع کرنے میں اپنے آپ کو حق بجانب سمجھتے ہیں کہ دین کے تمام خادم ہمیں اپنے رفیقِ راہ گردانیں گے ____ اس تصریح کی ضرورت اس لئے بھی ہے کہ ہم واقعۃً تمام دینی عناصر خصوصاً علمائے کرام کے تعاون کی شدید احتیاج محسوس کرتے ہیں۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ ○

تقریر مولانا امین احسن اصلاحی

خطبۂ مسنونہ کے بعد

بھائیو اور دوستو!

ایک طویل مدت کے بعد ہم خیال وہم مقصد دوستوں کی صحبت میسر آئی ہے تو معلوم نہیں دل کے کتنے گوشے ہیں جن کے دریچے کھل گئے ہیں اور کتنے سوئے ہوئے خیالات ہیں جو جاگ پڑے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان ساری باتوں کو ایک صحبت میں کہہ ڈالنا ممکن نہیں ہے۔ یہ تو جب بھی کہی جائیں گی مختلف قسطوں ہی میں کہی جائیں گی۔ اس وقت تو صورتِ حال یہ ہے کہ سِرا نہیں مل رہا ہے کہ بات کہاں سے شروع کی جائے، کیا بات کہی جائے کیا نہ کہی جائے اور شروع کرکے بات کہاں ختم کی جائے۔ اِس اُلجھن کی وجہ سے آپ مجھے اجازت دیجئے کہ میں گفتگو صرف اس قراداد کی وضاحت تک محدود رکھوں جو اپنے پورے مالۂ اور ماعلیہ کے ساتھ آپ کے سامنے آ چکی ہے۔

اس قرارداد کی وضاحت کرنے میں اس وجہ سے نہیں اٹھا کہ اِس میں کوئی ابہام واجمال ہے۔ یہ اپنے مقصد ومفہوم میں بالکل واضح ہے۔ جس طرح میں نے اس کو سمجھ لیا ہے اسی طرح آپ نے بھی اس کو اچھی طرح سمجھ لیا ہے۔ میری اس وضاحت کا مقصد صرف یہ ہے کہ اس میں جو نصبُ العین اور جو طریقۂ کار اپنانے کا ارادہ ظاہر کیا گیا ہے اس کے بعض دلائل آپ کے سامنے عرض کروں تا کہ اس کی پوری اہمیت آپ کے سامنے آ جائے۔

ہم نے اس قرارداد میں اللہ کا نام لے کر ایک ایسی تنظیم کے قیام کا فیصلہ کیا ہے: ''جو دین کی جانب سے عائد کردہ جملہ انفرادی واجتماعی ذمہ داریوں سے عہدہ برا ہونے میں ہماری مدد کرے!'' ____ قرارداد کا یہ جملہ دو اہم حقیقتوں کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ ایک اس حقیقت کی طرف کہ آپ تنظیم کو بجائے خود غایت و مقصد نہیں سمجھتے بلکہ اس کو صرف دین کی عائد کردہ انفرادی واجتماعی ذمہ داریوں کے ادا کرنے میں اپنے لئے ممدّ ومعاون سمجھتے ہیں۔ دوسرے اس بات کی طرف کہ آپ اپنا نصب العین دین کو سمجھتے ہیں اور اس دین کو اپنی انفرادی واجتماعی دونوں زندگیوں پر حاوی مانتے ہیں۔

جہاں تک پہلی بات کا تعلق ہے وہ درحقیقت ایک بڑے خطرے سے آگاہی ہے۔ وہ خطرہ یہ ہے کہ جماعتیں اور تنظیمیں قائم تو ہوئی ہیں اصلاً کسی اعلیٰ اور برتر نصب العین کے لئے، لیکن قائم ہو جانے کے بعد آہستہ آہستہ وہ خود نصب العین اور مقصد بن جاتی ہیں، اور اصل نصب العین غائب ہو جاتا ہے۔ آپ کو اس خطرے سے ہر قدم پر ہوشیار رہنا ہے۔ اس چیز نے نہ صرف جماعتوں اور تنظیموں کو تباہ کیا ہے، بلکہ ملتوں اور اُمتوں کو بھی بالکل برباد کر کے رکھ دیا ہے۔ اِس تغیر کا نتیجہ صرف یہی نہیں ہوتا کہ اصل مقصد غائب ہو جاتا ہے بلکہ مقصد وسیلہ اور ذریعہ کا ایک ادنیٰ خادم اور چاکر بن کے رہ جاتا ہے۔ پھر تنظیم مقصد کی خدمت نہیں کرتی بلکہ مقصد کو اپنی خدمت اور اپنے مفادات کے لئے استعمال کرتی ہے۔ مذہب کے نام پر قائم ہونے والی جماعتوں کے لئے یہ چیز خاص طور پر خطرناک ہے، اس لیے کہ جب اس طرح کی کوئی جماعت خود اپنے وجود اور اُس کے قیام وبقا کو مقصود بنا لیتی ہے تو وہ مذہب کی بھی جن چیزوں کو اپنے اِس مقصد کی راہ میں مزاحم پاتی ہے، اُن کو بدل کر اپنے جماعتی اغراض کے سانچے میں ڈھال لیتی ہے۔ مذاہب کی تاریخ ایک ساتھ شہادت دیتی ہے کہ اس چیز نے بے شمار تحریفات کی راہیں کھولی ہیں اور اس سے بڑے بڑے فتنے ظہور میں آئے ہیں۔ اس خطرے کے پیشِ نظر اس قرارداد میں اس امر کو خاص طور پر پیشِ نظر رکھا گیا ہے کہ تنظیم بجائے خود غایت ومقصد نہ بننے پائے بلکہ وہ اصل مقصد کے وسیلہ وذریعہ کی حد تک محدود رہے۔ قرارداد کے اس پہلو پر بہت سی باتیں کہنی ہیں جو آگے کے مراحل میں بتدریج آپ کے سامنے آئیں گی۔ اس کے لئے لازماً اس کے تنظیمی ڈھانچہ میں ایسی حد بندیاں کرنی پڑیں گی جو اس کو بے راہ روی اور گمراہی سے محفوظ رکھیں۔

جہاں تک دوسری چیز یعنی دین ہی کو نصب العین بنانے کا تعلق ہے یہ کم از کم ہمارے اور آپ کے لئے محتاجِ دلیل نہیں۔ ہم خدا کے فضل سے مسلمان ہیں اور ہمارا یہ پختہ عقیدہ ہے کہ انسانیت کی اصل ترقی وفلاح مذہب کے ساتھ وابستہ ہے۔ مذہب کے بغیر انسان بس ایک ترقی یافتہ حیوان ہے، جیسا کہ نظریۂ ارتقاء کے قائلین کہتے ہیں یا زیادہ سے زیادہ ایک حیوانِ ناطق جیسا کہ ارسطو نے انسان کی تعریف کی ہے۔ ہم ان دونوں میں سے کسی تعریف کو بھی انسان کی صحیح تعریف نہیں سمجھتے۔ ہمارے نزدیک انسان ایک رُوحِ یزدانی کا حامل ہے جیسا کہ قرآن نے: ''وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ'' کے الفاظ سے اس کی طرف اشارہ فرمایا ہے یہی رُوحِ یزدانی ہے جو انسان کا شرفِ خصوصی ہے اور اسی کی بدولت انسان مسجودِ ملائک بنا ہے۔ یہی رُوحِ ملکوتی اگر انسان کی رُوحِ بہیمی پر غالب رہے تو انسان حقیقی انسان ورنہ وہ بس دو ٹانگوں پر چلنے والا ایک جانور ہے۔ اس

رُوحِ ملکوتی کے رُوحِ بہیمی پر غالب رہنے کے لئے ضروری ہے کہ انسان کے ارادے کی باگ خدا کی شریعت کے ہاتھ میں ہو۔ اگر انسان کا ارادہ شریعت کے ہاتھ میں نہ ہو اور اس کی عقل خدا کی وحی سے رہنمائی حاصل نہ کرے تو جیسا کہ میں نے عرض کیا یہ کپڑوں میں ملبوس ایک جانور ہے۔ یہ جانور گدھا ہو سکتا ہے، کتا بھی ہو سکتا ہے اور بندر اور خنزیر اور ایک خوفناک درندہ بھی ہو سکتا ہے۔ چنانچہ قرآن نے شریعت سے بے قید انسان کو مذکورہ تمام جانوروں سے تشبیہ دی ہے۔ یہ تشبیہ محض برائے تشبیہ نہیں ہے بلکہ اظہارِ حقیقت ہے۔ اگر ہمارے پاس حقیقت کو دیکھنے والی آنکھیں ہوتیں تو اپنے سر کی آنکھوں سے دیکھ لیتے کہ ہمارے متمدّن شہروں میں کپڑوں میں ملبوس کتنے چوپائے اور درندے انسانوں کے بھیس میں پھر رہے ہیں۔ اور اس صفحۂ ارضی پر قوموں کی قومیں ہیں جو متمدن کہلانے کے باوجود اپنی سرشست کے اعتبار سے درندوں سے زیادہ سفاک اور خونخوار بن گئی ہیں۔

ہمارے لئے شریعت کے انتخاب کا معاملہ بھی کوئی پیچیدہ معاملہ نہیں ہے۔ ہم یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ اسلام تمام دنیا کا مشترک دین ہے اور قرآن خدا کی آخری اور کامل کتاب، اور محمد رسول اللہ ﷺ خدا کے آخری رسول ہیں۔ اس وجہ سے یہ عین ہمارے عقیدے کا تقاضا ہے کہ ہم اپنی زندگی اسلام کے احکام و ہدایت کے تحت گزاریں اور اسی کی دعوت دوسروں کو بھی دیں۔

یہ دوسروں کو دعوت دینا بھی عین ہماری فطرتِ بشری کا اقتضاء اور ہماری اپنی اصلاح اور ترقی کا لازمہ ہے۔ آپ اس حقیقت سے بے خبر نہیں ہو سکتے کہ انسان تنہا نہیں پایا جاتا، وہ ایک مدنی الطبع ہستی ہے۔ وہ کسی خاندان کے فرد، کسی قبیلہ کے رکن، کسی شہر کے شہری اور کسی ملک کے باشندے کی حیثیت سے پایا جاتا ہے اور اپنی فطری صلاحیتوں کے پروان چڑھنے کے لئے وہ ان سب باتوں کا محتاج ہے۔ اسی بنا پر انسان کو Social Animal کہا گیا ہے۔ جس طرح مچھلی پانی سے مستغنی نہیں ہو سکتی، اسی طرح انسان معاشرے سے مستغنی نہیں ہو سکتا۔ اگر انسان معاشرہ سے بے تعلق ہو کر اپنی صلاحیتوں کو صحیح طور پر اُجاگر کر سکتا تو اسلام رہبانیت کی ممانعت نہ کرتا۔ انسان اپنی فطرت کے لحاظ سے نبات میں سے Greepers سے مشابہ ہے۔ جس طرح انگور کی بیل صحیح طور پر اسی طرح پروان چڑھتی ہے جب اس کو کوئی سہارا ملے۔ بغیر اس سہارے کے وہ سکڑ کر رہ جاتی ہے۔ اسی طرح انسان بھی صحیح طور پر اسی طرح پروان چڑھتا ہے جب اس کو معاشرے کا سہارا ملے، بغیر اس سہارے کے اس کی صلاحیتیں سکڑ کے رہ جاتی ہیں۔

اس کے ساتھ ساتھ یہ امر بھی ضروری ہے کہ یہ سہارا اس کے روحانی تقاضوں کے موافق ہو۔ جس طرح انگور کی بیل اس سہارے کے اثرات میں سے حصہ لیتی ہے جس پر وہ چڑھتی ہے، اسی طرح انسان اس معاشرے کے خیر و شر سے متاثر ہوتا ہے، جس میں زندگی گزارتا ہے۔ انگور کی بیل کو نیم پر چڑھا دیجئے تو اس کے پھل کڑوے کسیلے ہو سکتے ہیں۔ اسی طرح انسان اگر بُرے معاشرے میں زندگی گزارے تو وہ بُرا بن سکتا ہے۔

انسان کی اس فطرت نے اس کے لئے ایک سخت مشکل پیدا کر دی ہے۔ ایک طرف تو اس کی فطرت کی رُو سے یہ واجب ہے کہ وہ اپنے لئے سازگار معاشرہ تلاش کرے اور اگر معاشرہ سازگار نہ ہو تو اپنے روحانی و اخلاقی تقاضوں کے لئے پورے اخلاص کے ساتھ اس کو سازگا بنانے کی جدوجہد کرے۔ اگر کوئی شخص یہ جدوجہد نہ کرے تو اس کی اخلاقی و رُوحانی موت یقینی ہے۔ اگرچہ کوئی شخص کسی دوسرے کی اصلاح پر اختیار نہیں رکھتا، دوسرے کی اصلاح اللہ کی توفیق پر منحصر ہے، لیکن ہر شخص خود اپنی اصلاح کے لئے اس جدوجہد پر اپنے امکان اور اپنی صلاحیتوں کی حد تک مامور ہے۔

اس وجہ سے ہمارے پیغمبر ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے کہ تم میں سے جو شخص کوئی برائی دیکھے اُس پر واجب ہے کہ وہ اپنے ہاتھ سے اس کی اصلاح کرے، اگر اس کی قدرت رکھتا ہو۔ اگر ہاتھ سے اس کی اصلاح کی قدرت نہ رکھتا ہو تو زبان سے اس کی اصلاح کی کوشش کرے، اگر اس کی صلاحیت نہ رکھتا ہو تو ادنیٰ درجہ کا ایمان یہ ہے کہ اس کو دل سے بُرا جانے (یعنی اس میں کسی نوعیت سے بھی تعاون نہ کرے!) اس سے نیچے ایمان کا کوئی درجہ نہیں ہے۔

معاشرہ سے متعلق افراد کی ذمہ داریوں کو واضح کرنے کے لئے حضورؐ نے معاشرہ اور افراد کو ایک کشتی کے مسافر سے تشبیہ دی ہے۔ ایک کشتی میں کچھ لوگ عرشے پر سفر کرتے ہیں اور کچھ لوگ اس کے نیچے کے حصے میں۔ فرض کیجئے نیچے والے یہ محسوس کرتے ہیں کہ ہمیں پانی لینے کے لئے اُوپر جانے کی مشقت اُٹھانی پڑتی ہے، کیوں نہ ہم اپنے حصے میں کشتی کے پیندے میں سوراخ کرلیں اور اوپر والے یہ خیال کریں کہ وہ اپنے حصے کی کشتی میں سوراخ کر رہے ہیں، ان کو اس ارادے سے باز رکھنے کی کوشش نہ کریں بلکہ سوراخ کرنے کے لئے ان کو آزاد چھوڑ دیں تو سوراخ ہو جانے کے بعد کشتی جو ڈوبے گی تو اُوپر والوں اور نیچے والوں سب کو لے کر ڈوبے گی۔ یہی حال معاشرے کا ہے، اس میں اچھے بھی ہوتے ہیں، بُرے بھی۔ اگر اچھے لوگ معاشرہ کے خیر و شر سے بے تعلق ہو جاتے ہیں تو بُروں کی برائی سے جو آفت ظہور میں آتی ہے اس میں اچھے اور بُرے دونوں ہی حصہ پاتے ہیں۔

حدیثوں میں ایک بستی کا ماجرا بھی بیان ہوا ہے، جس سے یہ حقیقت مزید واضح ہوتی ہے۔ مذکور ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک بستی کے متعلق فرشتہ کو حکم دیا کہ جا کر اُس کو اُلٹ دو۔ فرشتہ نے عرض کی کہ باری تعالیٰ اس میں تو تیرا ایک ایسا بندہ بھی ہے جو برابر تیری عبادت میں لگا رہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اس کے سمیت بستی کو

اُلٹ دو۔اس لئے کہ اُس کا چہرہ کبھی میرے دین کی بے حرمتی پر غیرت سے تمتمایا نہیں۔

اس تفصیل سے یہ حقیقت واضح ہوئی کہ ہمارے لئے اپنے معاشرے کے خیر وشر سے بے تعلق رہنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے، نہ ہماری فطرت اس بے تعلقی کی روادار ہے۔نہ ہمارا مذہب اِس کی اجازت دیتا ہے۔ دوسروں کی اصلاح سے قطع نظر ہم خود اپنی اصلاح وفلاح کے لئے اِس بات کے محتاج ہیں کہ اپنے معاشرے کو اپنے رُوحانی واخلاقی تقاضوں کے لئے سازگار بنانے کی کوشش کریں۔ اِس کوشش سے دوسروں کی اصلاح ہو یا نہ ہو،لیکن ہماری اصلاح ہوگی۔ اِس سے ہماری اپنی صلاحیتیں پروان چڑھیں گی اور ہماری اپنی فطرت کے مضمرات بروئے کار آئیں گے۔ جوشخص یہ کام کرتا ہے وہ خود اپنا فرض انجام دیتا ہے اور دوسروں سے زیادہ وہ خود اپنے اُوپر احسان کرتا ہے۔اس وجہ سے اگر کوئی شخص یہ فرض انجام دیتا ہے تو اُس کے لئے یہ زیبا نہیں ہے کہ وہ اپنے آپ کو معاشرہ کا محسن سمجھنے لگے بلکہ وہ یہ سمجھے کہ اُس نے اپنا ہی فرض انجام دیا ہے۔جس طرح ہم نماز پڑھتے ہیں تو کسی پر احسان نہیں کرتے بلکہ خود اپنے اُوپر احسان کرتے ہیں۔اسی طرح اگر ہم معاشرہ کی کسی بُرائی کی اصلاح کرتے ہیں تو کسی پر احسان نہیں کرتے بلکہ صرف اپنا فرض ادا کرتے ہیں۔ دین میں دوسروں کے نیک وبد سے متعلق ہم پر جو ذمہ داری عائد کی گئی ہے وہ ہمارے ذاتی فرض ہی کی حیثیت سے عائد کی گئی ہے۔

زیرِ بحث قرارداد میں یہ تصور اچھی طرح واضح کر دیا گیا ہے اور اس کے دو بڑے اہم فائدے ہیں۔ایک تو یہ ہے کہ کوئی شخص دعوت واصلاح کا کوئی کام کرتے ہوئے یہ نہیں سمجھے گا کہ وہ کسی دوسرے کا کام کر رہا ہے، بلکہ وہ یہی سمجھے گا کہ اپنا ہی کام کر رہا ہے۔ دوسرا یہ کہ کوئی شخص دوسروں کی اصلاح میں اتنا مستغرق نہیں ہوگا کہ وہ خود اپنی اصلاح سے غافل اور بے پروا ہو جائے۔ یاد رکھئے کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ دوسروں کی اصلاح کی کوشش اصلاً خود اپنی ہی اصلاح کی کوشش کا ایک حصہ ہے جو شخص دوسرے کی اصلاح میں رات دن سرگرم رہتا ہے لیکن اسے خود اپنی اصلاح کی فکر نہیں ہے، وہ محض نمائشی مصلح ہے۔ جو خود بھٹک رہا ہو وہ دوسروں کی رہبری نہیں کرسکتا۔ انگور کی وہ بیل سوکھ جاتی ہے جس کی اپنی جڑ اُکھڑی ہوئی ہو، اگر چہ اس کو کتنے ہی خوبصورت سہارے پر چڑھا دیجئے۔اس زمانے میں چونکہ زیادہ تر مدعیانِ اصلاح ایسے ہی ہیں جنہیں خود اپنے دین وایمان کا کچھ ہوش نہیں لیکن دوسروں میں دین کی سوغات بانٹنے کے لئے خشکی وتری کا سفر کرتے پھرتے ہیں، اس وجہ سے ضروری ہے کہ اصل نقطہ پر لوگوں کی توجہ مرکوز کرائی جائے۔ چنانچہ قرارداد میں اِس حقیقت کو یوں واضح کیا گیا ہے کہ: ''ہمارے نزدیک دین کا اصل مخاطب فرد ہے۔اُسی کی اخلاقی ورُوحانی تکمیل اور فلاح و نجات دین کا اصل موضوع ہے اور پیشِ نظر اجتماعیت اصلاً اسی لئے مطلوب ہے کہ وہ فرد کو اس کے نصب العین یعنی رضائے الٰہی کے حصول میں مدد دے۔''

اس تصور کا قدرتی مطالبہ یہ ہے کہ اس تنظیم کا ڈھانچہ ایسا بنایا جائے کہ وہ اپنے اعضاء وارکان کی اصلاح وتربیت کا ایک جامع ادارہ بن جائے۔اس عزم کا اظہار قرارداد میں ان الفاظ میں کیا گیا ہے:

''لہٰذا پیشِ نظر اجتماعیت کی نوعیت ایسی ہونی چاہئے کہ اُس میں فرد کی دینی واخلاقی تربیت کا کماحقہٗ لحاظ رکھا جائے اور اس امر کا خصوصی اہتمام کیا جائے کہ اس کے تمام شرکاء کے دینی جذبات کو جلا حاصل ہو، ان کے علم میں مسلسل اضافہ ہوتا رہے، ان کے عقائد کی تصحیح وتطہیر ہو، عبادت اور اتباعِ سنت سے اُن کا شغف اور ذوق وشوق بڑھتا چلا جائے، عملی زندگی میں حرام و حلال کے بارے میں اُن کی حس تیز اور اُن کا عمل زیادہ سے زیادہ مبنی برتقویٰ ہوتا چلا جائے اور دین کی دعوت واشاعت اور اس کی نُصرت واقامت کے لئے اُن کا جذبہ ترقی کرتا چلا جائے۔''

اِن تمام مقاصد کے حُصول کے لئے تنظیم کیا وسائل وذرائع اختیار کرے گی؟ اس کا جواب دینا بروقت میرے لئے مشکل ہے۔ اِس کا جواب بہت کچھ منحصر ہے اس بات پر کہ اس تنظیم کو کن صلاحیتوں کے افراد حاصل ہوتے ہیں اور وہ اپنی مجموعی کوشش سے کیا اسباب ووسائل فراہم کرنے پر قادر ہوتے ہیں۔افراد اور وسائل کی وسعت کے ساتھ ساتھ امکانات کا جائزہ لینا اوران کے مطابق قدم اٹھانا تنظیم کے اربابِ حل وعقد کا کام ہے لیکن اتنی بات بدیہی ہے کہ اس مقصد کے بروئے کار لانے میں اس امر کی پوری کوشش کی جائے گی کہ جو قدم بھی اُٹھے اسوۂ انبیاء کی روشنی میں اُٹھے اور جماعت کی تربیت اس نہج پر ہو جس کی طرف کتاب وسنت میں رہنمائی کی گئی ہے۔

ہم اپنی تربیت کے لئے سب سے پہلے تو صحیح علم کے محتاج ہیں۔صحیح علم سے مراد دین کا علم ہے۔اس زمانے میں دین کا علم عنقا ہو رہا ہے، اس کے حصول کے لئے وسائل وذرائع بھی روز بروز کم سے کم تر ہوتے جارہے ہیں اور لوگوں کے اندر اس کی رغبت بھی بالکل ختم ہوتی جارہی ہے۔اگر دین کا علم ہی مٹ گیا تو پھر دین کے باقی رہنے کا کیا امکان ہے؟ یہ امر بھی بدیہی ہے کہ اِس زمانے میں لوگ ہر چیز کی دلیل وحجت کو سمجھنا چاہتے ہیں۔ مجرد یہ بات لوگوں کو اپیل نہیں کرتی کہ فلاں بات دین کی بات ہے۔ دین پر آج جو اعتراضات ہورہے ہیں، کل کے اعتراضات سے بالکل مختلف ہیں۔ یہ اعتراضات جدید مغربی فکر وفلسفہ کی پیداوار ہیں اور ان کو زور وقوت کے ساتھ پھیلانے والے خود ہمارے اندر پیدا ہو گئے ہیں۔ جب تک ان اعتراضات وشبہات کا مؤثر ازالہ نہ ہو اس وقت تک ممکن نہیں ہے کہ آپ دین کی کوئی مفید خدمت انجام دے سکیں۔افسوس ہے کہ اس خدمت کی صلاحیت رکھنے والے آج ہمارے اندر اگر مفقود نہیں تو اتنے کم ہیں کہ وہ دین کے محاذ کو کسی طرح

بھی سنبھال نہیں سکتے۔ اس وجہ سے وقت کی ایک بہت بڑی ضرورت یہ ہے کہ ایسے حاملانِ دین پیدا کرنے کی مؤثر جدوجہد کی جائے جو جدید علوم و افکار سے بھی کماحقہٗ آگاہ ہوں اور کتاب و سنت کے دلائل و براہین پر بھی وہ براہِ راست نظر رکھتے ہوں۔ میں اس بات پر یقین رکھتا ہوں کہ ہمارا دین دنیا میں بے دلیل نہیں آیا ہے۔ وہ بہتر سے بہتر فطری و عقلی دلائل سے مسلح ہو کر آیا ہے، جو ہر دور کے فتنوں کا مقابلہ کرنے کے لئے کافی ہیں، بشرطیکہ ان کو اُجاگر کرنے والے اور اُن کو دنیا کے سامنے حالات کے مطابق پیش کرنے والے موجود ہوں۔ دوستو! یہ کام کوئی آسان کام نہیں ہے۔ اس قسم کے افراد صرف اُردو میں لکھی ہوئی چند کتابیں پڑھ لینے سے نہیں پیدا ہوں گے، بلکہ اس کے لئے کتاب و سنت اور علومِ اسلامیہ سے براہِ راست گہری واقفیت ضروری ہے۔ میں جانتا ہوں کہ اس قسم کی صلاحیت ہم میں سے ہر شخص اپنے اندر نہیں پیدا کر سکتا۔ لیکن معتدبہ تعداد ہمارے اندر جب تک ایسے لوگوں کی نہ ہو گی ہم ان ذمہ داریوں سے کماحقہ عہدہ برآ نہ ہو سکیں گے جو دین سے متعلق اس زمانے میں ہم پر عائد ہوتی ہیں۔

جہاں تک عامۃ المسلمین کو دین کی دعوت دینے کا تعلق ہے اس کے بارے میں مجھے یہ کہنے کی اجازت دیجئے کہ اِس زمانے میں مجرد تذکیر کافی نہیں ہے، بلکہ وسیع پیمانے پر تعلیم و تفہیم کی ضرورت ہے۔ یہ صورت نہیں ہے کہ لوگ دین کی باتیں بھولے ہوئے ہیں، اگر انہیں یاد دِلا دی جائیں تو وہ ان کو اختیار کر لیں گے، بلکہ اشاعتِ باطل کے وسیع ذرائع نے اِس زمانے میں عام اذہان کے اندر بھی دین اور دینی احکام سے متعلق بے شمار غلط فہمیاں بھی دی ہیں جن کے دُور کرنے کا سامان کرنا ان لوگوں پر واجب ہے جو آج ملک کے عوام کی اس پہلو سے کوئی خدمت کرنا چاہتے ہوں۔ آج اخبارات گھر گھر پہنچ رہے ہیں۔ ریڈیو کھیتوں اور کھلیانوں تک موجود ہے۔ اس وجہ سے یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ زندگی کے جدید شیطانی نظریات سے ہمارے عوام بے خبر ہیں یا وہ ان سے بالکل بے تعلق ہیں۔ ان سے تاثر کے معاملے میں شہری اور دیہاتی آبادی میں کچھ فرق ہونا تو ایک قدرتی امر ہے لیکن دیہاتی آبادی کو ان فتنوں سے بالکل الگ تھلگ خیال کرنا صحیح نہیں ہے۔ اِس وجہ سے ان کے اندر کام کرنے کے وہ طریقے اختیار کرنے ہوں گے جو موجودہ حالات میں اُن کے لئے مؤثر اور مفید ہوں۔

جہاں تک ملک کے اربابِ اقتدار کا تعلق ہے اُن کے بارے میں بھی ہمارے ہاں سخت افراط و تفریط پائی جاتی ہے۔ ایک تو وہ لوگ ہیں جو اُن کی اصلاح کے معاملے میں بالکل بے تعلق ہیں، انہیں اُن کے خیر و شر سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ دوسرے وہ لوگ ہیں جو ان کے شر کو بھی خیر ہی کہنا پسند کرتے ہیں۔ تیسرے وہ لوگ ہیں جو اُن کے خیر کو بھی شر قرار دیتے ہیں اور ہر حالت میں اُن کی مخالفت کرنا اُن کے ہاں جزوِ ایمان ہے۔

آپ کی یہ قرارداد اِن تینوں طریقوں کو غلط قرار دیتی ہے اور دین کی روشنی میں ایک چوتھا طریقہ آپ کے سامنے پیش کرتی ہے۔ جہاں تک پہلے طریقے یعنی لاتعلقی کے رویہ کا تعلق ہے اس کے بارے میں تفصیل کے ساتھ میں عرض کر چکا ہوں کہ اسلام میں اس کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ یہ کوئی پرایا جھگڑا نہیں ہے جس سے علیحدہ رہنے میں آدمی کے لئے سعادت ہو۔ بلکہ ہم میں سے ہر شخص کے اپنے دین و ایمان کا معاملہ ہے۔ میں پیغمبر ﷺ کی واضح تعلیمات کی روشنی میں بتا چکا ہوں کہ جو شخص معاشرہ کے خیر و شر سے بے پرواہ ہے وہ خود اپنے دین و ایمان سے بے پرواہ ہے اور اُس کی یہ بے پروائی اُس کی ساری دینداری غارت کر کے رکھ دے گی۔ ہم جس کشتی پر سوار ہیں اپنے امکان کی حد تک کسی کو اس کے پیندے میں سوراخ کرتے ایک تماشائی کی طرح نہیں دیکھ سکتے۔

دوسرے گروہ کا رویہ بھی بالکل غلط ہے۔ جو چیز غلط ہے اگر وہ اربابِ اقتدار کی طرف سے ظہور میں آئے تو اُس کی غلطی اور بھی سنگین ہو جاتی ہے۔ اس لئے کہ اس کے اثرات بہت دور رس ہوں گے۔ اگر کوئی شخص اس غلطی کو ثواب قرار دے تو یہ اُس پر خاموش رہنے سے بھی بڑا جُرم ہے۔ یہ رویہ اگر خوف یا طمع کی بنا پر اختیار کیا جائے تو اسلام میں صریح نفاق ہے، جو ایمان کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتا اور اگر یہ اس بنیاد پر اختیار کیا جائے کہ اس سے حکومت کو ضعف پہنچتا ہے تو یہ بھی غلط ہے اول تو حکومت کو ضعف پہنچ سکتا ہے تو غلط چیز سے نہ کہ صحیح چیز سے، ثانیاً حکومت بجائے خود مقصد و غایت نہیں ہے، بلکہ اسلام میں وہ اللہ کے قانونِ عدل و قسط کا ذریعہ ہے۔ اس وجہ سے حکومت کی مصلحت کے لئے بھی کسی شر کو خیر قرار دینا اپنے دین و ایمان پر کلہاڑی مارنا ہے۔

تیسرے گروہ کا رویہ بھی بالکل غلط ہے۔ اربابِ اختیار کی ہر بات کو ہدفِ تنقید بنا لینا یہاں تک کہ اُن کے خیر کو بھی شر قرار دینا اور اُس کی مخالفت میں اِس حد تک بڑھ جانا کہ دوسروں کی بُرائیاں بھی اُن کے کھاتے میں ڈال دینا نہ عقل و منطق کی رُو سے جائز ہے، نہ اسلام کی رُو سے۔ یہ اقتدار کی ہوس میں اندھے ہو جانے کی علامت ہے، اور اس کا سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ ایسے لوگوں کی صحیح بات بھی اربابِ اقتدار کو اپیل نہیں کرتی۔ جن کی ذہنیت یہ بن جاتی ہے وہ خیر خواہی کے جذبے سے بالکل خالی ہو جاتے ہیں۔ درانحالیکہ یہ جذبہ دعوتِ دین کی اصل روح ہے۔ اگر انسان خیر خواہی کے جذبے سے خالی ہو تو اُس کی ہر بات نفرت اور عناد کی تخم ریزی کرتی ہے اور اگر وہ اس کے ساتھ دین کا نام لیتا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ دین کو بھی لوگوں کی نگاہوں میں ایک نفرت انگیز چیز بنانا چاہتا ہے۔ ایسے لوگوں کے ہاتھوں دین کو جو نقصان پہنچا ہے، وہ دین کے کھلے ہوئے دشمنوں کے ہاتھوں بھی نہیں پہنچا ہے۔ اس لئے کہ یہ لوگ اپنی ایک نفسیاتی جنگ میں دین کو

ایک ہتھیار کے طور پر استعمال کرتے ہیں اور اس طرح بلاوجہ دین کو ان تمام لوگوں کے سامنے ایک حریف بنا کر کھڑا کر دیتے ہیں، جن سے ان کی لڑائی ہوتی ہے۔ میں نے دیکھا ہے کہ اس طرح کے لوگ انسانیت اور خلق کی محبت سے بالکل عاری ہوتے ہیں۔ یہ لوگ دل سے اس بات کے آرزومند ہوتے ہیں کہ ملک میں زلزلے آئیں، قحط پڑیں، سیلاب آئیں، وبائیں پھیلیں تاکہ یہ ان سب چیزوں کا ذمہ دار حکومت کو ٹھہرا کر اپنے اقتدار کے لئے راہ ہموار کریں۔ ایسے بے درد اور سنگ دل لوگوں سے یہ توقع رکھنا کہ یہ دین کی کوئی خدمت انجام دے سکیں گے، محض خام خیالی ہے۔

آپ نے جو قرارداد پاس کی ہے اُس میں آپ نے ان تمام طریقوں سے الگ اپنے لئے "الدین النصیحة" کی راہ اختیار کی ہے، جس کے معنی یہ ہیں کہ آپ لوگوں کے خیر وشر سے بے نیاز نہیں ہو سکتے، اس لئے کہ یہ خیرخواہی کے خلاف ہے۔ اسی طرح آپ کسی کے شر کو خیر بھی نہیں کہہ سکتے، اس لئے کہ یہ بھی حق اور خیرخواہی کے خلاف ہے۔ علیٰ ہذا القیاس آپ کسی کی مخالفت کے جوش میں اس کی نیکی کو بدی نہیں ٹھہرا سکتے، اس لئے یہ بھی سچائی اور خیرخواہی کے خلاف ہے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ آپ دین کو ہوسِ اقتدار کی جنگ میں ایک ہتھیار کے طور پر کبھی استعمال نہیں کریں گے بلکہ جس کے سامنے بھی اس کو پیش کریں گے، اللہ کے دین کی حیثیت سے پیش کریں گے، کہ اسی میں اُس کی بھی بھلائی اور اسی میں آپ کی بھی بھلائی ہے۔ یہی حضرات انبیاء علیہ السلام کا طریقِ کار ہے اور یہی آپ کو اختیار کرنا ہے۔

رفیقو! میں سمجھتا ہوں کہ ایک چیز کی وضاحت کرنے میں آپ کا بہت سا وقت میں نے لیا۔ اب میں اپنی تقریر ختم کرتا ہوں اور اپنے لیے اور آپ کے لئے دعا کرتا ہوں کہ ہم نے جو کچھ طے کیا ہے، اس پر عمل کرنے کی توفیق پائیں۔

اَقُوْلُ قَوْلِی هٰذَا وَاَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ لِیْ وَلَكُمْ وَلِسَائِرِ الْمُسْلِمِیْنَ وَالْمُسْلِمَاتِ!

عن تمیم الداری رضی الله عنه

اَنّ رسول الله صلی الله علیه وسلم قال:

اِنَّ الدِّیْنَ النَّصِیْحَةُ

قُلْنَا: لِمَنْ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ؟

قَالَ: لِلّٰهِ، وَلِكِتَابِهٖ، وَلِرَسُوْلِهٖ، وَلِاَئِمَّةِ الْمُسْلِمِیْنَ وَعَامَّتِهِمْ

(رواہ مسلم)

تقریر مولانا عبدالغفار حسن

حمد وثناء کے بعد

رفقائے محترم!

صبح کے درسِ قرآن، پھر قرارداد اور اس کی توضیح اور سب سے بڑھ کر مولانا اصلاحی کی تقریر سے معاملے کے اکثر پہلو اچھی طرح واضح ہو چکے ہیں اور اب میری تقریر کی کوئی خاص ضرورت نہ تھی، تاہم جو خدمت میرے سپرد ہے میں اس کی انجام دہی میں بعض باتیں آپ حضرات کے سامنے رکھتا ہوں۔ تکرار سے بھی کم از کم تذکیر کا فائدہ تو حاصل ہو ہی جائے گا۔

ایک نئی دینی جماعت کے قیام کے فیصلے پر سب سے پہلے جو سوال ذہنوں میں پیدا ہونا لازمی ہے وہ یہ ہے کہ آخر ایک نئی جماعت کی ضرورت کیا ہے؟ اوّلاً کیا انفرادی طور پر کام کرنا کافی نہیں ہے؟ ثانیاً اگر اجتماعیت لازمی ہے تو بھی ڈیڑھ اینٹ کی ایک نئی مسجد الگ بنانے کی کیا حاجت ہے؟ بہت سی دینی تنظیمیں اور جماعتیں موجود ہیں، کیوں نہ ان میں سے کسی کے ساتھ شامل ہو کر کام کیا جائے؟

جہاں تک اجتماعیت کی ضرورت واہمیت کا تعلق ہے اس پر مولانا اصلاحی بہت مفصل روشنی ڈال چکے ہیں۔ یہ بدیہی بات ہے کہ بہت سے لوگوں کے علیحدہ علیحدہ کام کرنے اور ان سب کے مل کر اجتماعی طور پر کام کرنے میں نتائج کے اعتبار سے زمین آسمان کا فرق واقع ہو جاتا ہے۔ اجتماعیت میں ہر فرد ایک دوسرے کا سہارا اور ایک دوسرے کی کمی پورا کرنے والا ہوتا ہے جس سے کام میں عظیم برکت ہوتی ہے۔ ظاہر بات ہے کہ اللہ نے مختلف لوگوں کو مختلف صلاحیتیں دی ہیں۔ کسی کو بولنے کی صلاحیت دی ہی، کسی کو لکھنے کی، کسی کو بھاگ دوڑ کی قوت دی ہے، کسی کو غور وفکر اور تدبر وتفکر کی اسی طرح کسی کو علومِ دینی سے سرفراز فرمایا ہے اور کسی کو معلوماتِ دنیوی سے بہرہ ور فرمایا ہے۔ کسی کو فہمِ قرآن کے بحرِ عمیق میں غوطے لگانے کی صلاحیت دی ہے تو کسی کو علومِ حدیث کی وسعتوں میں پیراکی کی صلاحیت سے نوازا ہے۔

کسی کو قدیم کی واقفیت عطا فرمائی ہے تو کسی کو جدید سے رُوشناس کیا ہے مختلف صلاحیتوں اور قوتوں سے مسلح افراد کے مجتمع اور متحد ہو کر کام کرنے سے ہی اس بات کی توقع کی جاسکتی ہے کہ کوئی جامع اور ہمہ گیر نوعیت کا کام سرانجام پا سکے پھر دین و مذہب کے مخالف اور لادینیت کے علمبرداروں کو دیکھئے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ پوری طرح منظّم ہو کر کام کر رہے ہیں اور ان کے مختلف گروہ اور جتھے مختلف اطراف سے پوری تنظیم اور اجتماعیت کے ساتھ دینی قوتوں پر یلغار کر رہے ہیں۔ اب ظاہر ہے کہ اجتماعیت کا مقابلہ انفرادیت سے نہیں کیا

جاسکتا اس کے لئے اجتماعیت ہی کی ضرورت ہے۔ بنابریں دینی قوتوں کا منظّم و مجتمع ہونا ایک ناگزیر ضرورت ہے۔

بلاشبہ جماعت سازی سے کچھ اندیشے بھی لاحق ہوتے ہیں مثلاً ایک یہ کہ اس سے جماعتی و گروہی عصبیت، پھر تعصب اور بالآخر تحزّب وتفرق کی لعنت وجود میں آتی ہے۔ دوسرے یہ کہ جماعتیں بالعموم شخصیتوں کے گرد گھومتی ہیں اور ان سے شخصیت پرستی کی مہلک بیماری پیدا ہوتی ہے۔ تیسرے یہ کہ خود جماعتیں عموماً داخلی انتشار کا شکار ہو جاتی ہیں اور بعض اوقات اس سے انتہائی کریہہ صورتِ حال پیدا ہو جاتی ہے۔

اس سلسلے میں اوّلین بات تو یہ ہے کہ ہر چیز کے مجموعی فائدے یا نقصان کو پیشِ نظر رکھنا چاہئے۔ بہت سے اچھے کاموں میں کوئی پہلو بُرائی کا ہو سکتا ہے اور بہت سی برائیوں میں کوئی پہلو اچھائی کا ہونا ممکن ہے۔ قرآن مجید نے خود شراب اور جوئے کے بارے میں بھی یہ تسلیم کیا ہے کہ ان میں منفعت بھی ممکن ہے لیکن وَاِثْمُهُمَا اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا ''ان کا شر ان کی منفعت سے زیادہ ہے'' اس سے معلوم ہوا کہ جس چیز میں خیر کا پہلو غالب ہو اس کو اختیار کرنا چاہئے اور اس کے شر سے بچاؤ کی ہر ممکن تدبیر کرنی چاہئے۔

'شخصیت پرستی' کی لعنت کے پیدا ہونے کے امکانات وہاں زیادہ ہوتے ہیں جہاں کسی ایک داعی کی دعوت پر لوگ جمع ہوں اور اسی کے خیالات ونظریات وتصورات اور اسی کے فہم وفکر کو اس اجتماعیت میں مرکز ومحور کی حیثیت حاصل ہو جائے۔ اس کے برعکس اگر ابتداء سے بہت سے لوگ باہمی مشاورت سے اپنے مقصد اور اس کے حصول کے طریق کو طے کریں اور مسلسل ''اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ'' کی قرآنی ہدایت پر عمل پیرا رہیں تو ان شاء اللہ اس لعنت کا سدّ باب ہو جائے گا۔

''تحزّب وتفرق'' سے بچنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ دین کی خدمت کے لئے جمع ہونے والے لوگ ہمیشہ اِنَّنَا مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ہی کو اپنا واقعی شعار بنائیں اور اپنے آپ کو اُمتِ مسلمہ ہی کا ایک حصہ تصور کریں۔ چنانچہ نہ ان میں کوئی غرور وگھمنڈ پیدا ہو نہ اپنے ''چیزے دگر'' ہونے کا احساس پیدا ہونے پائے اور نہ ہی وہ اپنے آپ کو عام مسلمانوں سے کسی اعتبار سے بہتر وبرتر تصور کریں۔

یہاں یہ حقیقت بھی نگاہ میں رہنی چاہئے کہ تحزّب وتفرق محض جماعت سازی ہی سے پیدا نہیں ہوتے بلکہ کوئی ادارہ محض درس گاہ یا دارالعلوم بھی ان کا سبب بن سکتا ہے، اور واقعہ یہ ہے کہ بنا ہے، اور اس کی مثالیں خود ہمارے ملک میں موجود ہیں۔ ظاہر بات ہے کہ جو درسگاہ نئی قائم ہوتی ہے وہ بالعموم کسی ایک خصوصیت کی حامل ہوتی ہے۔ نتیجتًا اس سے فارغ ہونے والے نوجوانوں کا مزاج ایک خاص رنگ میں ڈھلنا شروع ہو جاتا ہے اور مرورِ ایام کے ساتھ اس کے فارغین ومتوسلین میں گروہی وحزبی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اب نہ تو یہ صحیح ہے کہ ان خدشات کی بنا پر درس گاہیں اور دارالعلوم قائم کرنے بند کر دیئے جائیں اور نہ یہ صحیح ہے کہ دینی مقاصد کے حصول کے لئے ادارے یا جماعتیں قائم کرنا ممنوع قرار دے دیا جائے۔ اس کے برعکس دارالعلوموں اور اداروں کے قیام کے ساتھ حتی الامکان ایسی احتیاطی تدابیر اختیار کی جانی چاہیں کہ ان کے ذریعے اُمت میں تفرقہ وانتشار پیدا نہ ہو۔ اس سلسلے میں جس قدر میں نے غور کیا ہے میں اسی نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ایک تو جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے لوگوں میں کچھ ''چیزے دگر'' ہونے کے احساس کو پیدا ہونے سے روکا جائے اور ''اِنَّنِيْ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ'' کی قرآنی ہدایات کو ہمیشہ متحضر رکھا جائے اور دوسرے یہ احتیاط کی جائے کہ عملاً جمعہ وجماعت اور ربط وضبط اور رشتوں ناطوں کے معاملات کو صرف ہم خیال لوگوں کے حلقے میں محدود کرنے کا رجحان نہ پیدا ہو ــــــ ان تدابیر پر اگر عمل کیا جائے تو میری رائے میں کوئی دینی جماعت فرقے میں تبدیل نہیں ہوگی ــــ واللہ اعلم!

تیسرا اندیشہ جماعتوں کے 'داخلی انتشار' کا ہے تو اگرچہ ماضی کے کچھ تلخ تجربات کی روشنی میں واقعتًا اس اندیشے سے طبیعت میں بہت زیادہ توحّش پیدا ہوتا ہے تاہم یہ حقیقت بادنیٰ تامل سامنے آجاتی ہے کہ محض اس اندیشے کی بنا پر اجتماعی جدوجہد سے باز رہنا ہرگز ایک معقول بات نہیں ہے۔ اختلاف اس عالمِ واقعہ کی ایک عظیم (اگرچہ تلخ) حقیقت ہے ــــــ لَا يَزَالُوْنَ مُخْتَلِفِيْنَ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ رَبُّكَ تحریکیں اُٹھتی ہیں اور بہت کچھ مفید کام کرتی ہیں پھر ان میں داخلی انتشار رونما ہو جاتا ہے تو ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہ آپ اپنے خنجر سے خود کشی کر لیتی ہیں لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا صحیح نہیں ہے کہ ان کا کام نسیاً منسیاً ہو جاتا ہے۔ ان کے اثرات ان کے بہت بعد تک بھی باقی رہتے ہیں ــــــ لہٰذا ضرورت اس کی ہے کہ خلوص اور للّٰہیت کے ساتھ کام شروع کیا جائے۔ اختلافات کے حل کے لئے صحت مند راستے حتی الامکان کھلے رکھے جائیں۔ اس کے بعد بھی کبھی ناگوار صورتِ حال پیدا ہو تو اس کا سامنا کیا جائے۔

اب دوسرے سوال کو لیجئے ــــــ یعنی یہ کہ آخر ایک نئی جماعت کا قیام ہی کیوں ضروری ہے؟ کیوں نہ موجود الوقت دینی جماعتوں میں سے کسی کے ساتھ مل کر کام کیا جائے؟

اس سوال کا سادہ سا جواب تو یہ ہے کہ جس طرح ملک میں بہت سی درس گاہوں اور دارالعلوموں کے وجود سے یہ لازم نہیں آتا کہ کوئی نئی درس گاہ قائم نہ کی جائے۔ اسی طرح بہت سی دینی جماعتوں کا وجود کسی نئی جماعت کے قیام دارالعلوم کے مؤسسین کے بارے میں لازماً یہ نہیں سمجھا جاتا کہ ان کی رائے بقیہ درس گاہوں کے بارے میں بہت بُری ہے، اس طرح ایک نئی دینی جماعت کے مؤسسین کے بارے میں یہ سمجھنا کہ یہ لازماً دوسری دینی جماعتوں کے بارے میں بہت بُری یا حقارت آمیز رائے رکھتے ہیں، درست نہیں ہے۔

مزید وضاحت کے لئے عرض ہے کہ اس وقت جو جماعتیں ملک میں بالفعل موجود ہیں ہمارے نقطۂ نظر سے ان کی دو قسمیں ہیں۔ ایک تو وہ ہیں جن سے ہمیں کلّی اختلاف ہے یعنی ان کے طریقِ کار اور ان کے مزاج اور ذہن کو ہم درست نہیں سمجھتے۔ ایسی جماعتوں میں مدغم ہونے یا ان کے ساتھ مل کر کام کرنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ______ دوسری جماعتیں ایسی ہیں جو ہماری رائے میں بعض کام بہت اچھے سرانجام دے رہی ہیں لیکن ان کے کاموں میں کچھ خلا ہے اور دین کے بعض تقاضے اس کے ذریعے پورے نہیں ہو رہے ہیں۔ ______ ایسی جماعتوں کے ساتھ دو طرح کا معاملہ نظری اعتبار سے ممکن ہے۔ ایک یہ کہ ان کے ساتھ شامل ہو کر کام کیا جائے اور ان کے اندر رہ کر زور ڈالا جائے کہ دین کے تقاضوں کو بھی پورا کیا جائے۔ یہ طریق بظاہر بڑا معقول اور مستحسن نظر آتا ہے لیکن عملاً اپنے اندر بہت سی پیچیدگیاں رکھتا ہے۔ ہر جماعت کے مؤسسین کا ایک خاص مزاج ہوتا ہے اور ان کے ذہن کی ایک خاص ساخت ہوتی ہے جسے بآسانی بدلا نہیں جا سکتا، اور اگر بدلنے کی کوشش کی جائے تو اس کے سوا کچھ حاصل نہیں ہو سکتا کہ خواہ مخواہ کی کھینچ تان اور بدمزگی پیدا ہو اور ہاتھ کچھ نہ آئے۔ ظاہر بات ہے کہ اگر ان کے نزدیک کوئی دوسرا پہلو اہم تر ہے تو وہ آپ کی وجہ سے کسی اور پہلو پر کیوں زیادہ زور دیں۔ لہٰذا عملاً دوسرا طریق ہی ممکن العمل بھی ہے اور بہتر بھی یعنی یہ کہ دوسرے لوگ ایک علیحدہ اجتماعیت قائم کریں اور اپنے ذہن و فکر اور اپنی صوابدید کے مطابق کام کریں ______ اب اگر خلوص اور للّٰہیت موجود ہے تو یہ دونوں کام ایک دوسرے کے معاون اور ایک دوسرے کی کمی کو پورا کرنے والے بن جائیں گے اور اگر اخلاص کی دولت ہی سے تہی دامنی ہو تو پھر بھی زیادہ سے زیادہ یہی ہوگا جیسا تصادم اندر تھا ویسا ہی باہر بھی ہوگا۔ اس صورت میں بھی علیحدہ جماعت سازی پہلی صورت کے مقابلے میں زیادہ نقصان دہ تو کسی طرح نہیں ہو سکتی ______!

اب میں آپ کے سامنے اس نئی دینی تنظیم کے کچھ خصائص پیش کروں گا، جس کے قیام کے لئے ہم یہاں جمع ہوئے ہیں۔ ان کا تذکرہ قرارداد میں بھی ہے اور ان کی توضیحات میں بھی۔ پھر مولانا اصلاحی بھی اپنی تقریر میں ان میں سے بعض کی وضاحت کر چکے ہیں۔ میں ان کو سلسلہ وار پیش کرتا ہوں تاکہ جیسا کہ میں نے شروع میں عرض کیا تھا کم از کم تذکیر ہو جائے:

پہلی خصوصیت ہماری پیشِ نظر تنظیم کی یہ ہے کہ اس میں نصب العین کے مقام پر صرف نجات اور رضائے الٰہی کے حصول کو رکھا گیا ہے اور اس میں ایسی کوئی تفریق نہیں رکھی گئی کہ دنیا میں ہمارا مقصود یہ ہے اور آخرت میں یہ! ______ دنیا دار العمل ہے اور آخرت دارِ جزا۔ دنیا میں انسان دین و شریعت کے جملہ تقاضوں کو اُخروی جزا ہی کے لئے پورا کرتا ہے۔ لہٰذا ہر آن اور ہر لمحہ ہمارا نصب العین ایک ہی ہے اور وہ ہے آخرت کی کامیابی!! اور اس کے لئے دین کے جملہ انفرادی و اجتماعی تقاضوں کو اسی ترتیب و تدریج کے ساتھ پورا کرنا ضروری ہے جو خود نظامِ دین میں متعین ہے! ان میں سے کسی ایک تقاضے کو اہمیت دے کر 'نصب العین' کے مقام پر لے آنا ہرگز صحیح نہیں!

دوسری خصوصیت ہماری اس تنظیم کی ہوگی کہ ہماری دعوت صرف اللہ اور اس کے دین کی طرف ہوگی، نہ کسی خاص شخصیت جماعت کی طرف ہوگی، نہ کسی خاص مسلک یا فقہی مذہب کی طرف!

اسی بنا پر اس اجتماعیت کی تیسری خصوصیت یہ ہوگی کہ یہ نہ کسی فرد یا گروہ کی حلیف ہوگی نہ حریف۔ اس میں حُبّ اور بغض اور محبت و نفرت کا معیار صرف اللہ اور اس کا دین ہوں گے اور یہ ''كُوْنُوْا قَوّٰامِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ'' کے قرآنی حکم پر عمل پیرا ہونے کی مقدور بھر سعی کرے گی اور حتی الامکان کوشش کرے گی کہ ذاتی یا گروہی عصبیت یا تعصب کی بنا پر عدل کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹنے پائے۔ ﴿لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَنْ لَّا تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى﴾ ______ چنانچہ ہمارے لئے کسی حزبِ اختلاف کا تصور خارج از بحث ہوگا ______ مغربی جمہوریت کے پیدا کردہ ان تصورات سے عدل و انصاف کے تقاضے پامال ہو جاتے ہیں اور انسان اپنی جماعت کے بُرے سے بُرے کام کی حمایت اور حزبِ مخالف کے اچھے سے اچھے کام کی مخالفت پر مجبور ہو جاتا ہے۔ پیشِ نظر اسلامی تنظیم ان شاء اللہ ﴿تَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ﴾ کے قرآنی احکامات پر عمل پیرا ہوگی۔

چوتھی خصوصیت ہماری اس اسلامی تنظیم کی یہ ہوگی کہ یہ طبقاتی تصور اور اس سے پیدا شدہ تنازع للبقا کے بجائے وحدتِ الٰہ و آدم اور توافق یا تعاون للبقا کے تصور کو اجاگر کرنے کی کوشش کرے گی۔

پانچویں خصوصیت دینی مسائل اور ان سے متعلق اختلاف مذاہب و مسالک کے متعلق ہے۔ ہمارے نزدیک جملہ دینی مسائل تین طرح کے ہیں۔ ایک وہ جو اساسی اور بنیادی بھی ہیں اور متفق علیہ بھی، دوسرے وہ جو متفق علیہ تو ہیں لیکن اساسی نہیں ہیں۔ اور تیسرے وہ مسائل ہیں جن میں سلف اور خیر القرون ہی سے اختلاف چلا آ رہا ہے۔ ہماری یہ تنظیم ان شاء اللہ اپنی اصل توجہ کا مرکز و محور پہلی قسم کے مسائل ہی کو بنائے گی۔ اس لئے بھی کہ فی الواقع وہی اساسی اور بنیادی ہیں اور اس لئے بھی کہ موجودہ دَور کے فتنوں کی زد دراصل ان ہی پر پڑ رہی ہے، یعنی ایمان باللہ، ایمان بالرسالت، اور ایمان بالآخرت ہی خطرے میں پڑ گئے ہیں لہٰذا اس وقت اصل ضرورت ان کے استحکام کی ہے، اور ان کے معاملے میں کسی قسم کی رواداری اور مداہنت کا کوئی امکان نہیں ہے۔ دعوت میں نرمی اور حکمتِ تبلیغ بالکل دوسری چیز ہے اور مداہنت فی الدین بالکل دوسری، ان معاملات میں مصلحت کی بنا پر رواداری ممکن نہیں ہے ______ البتہ تیسری قسم کے مسائل میں تشدد اور غلو کسی

طرح جائز نہیں ہے۔ ان میں بھی مذاکرہ اور باہمی تبادلہ خیال ہوسکتا ہے لیکن کسی ایک رائے یا مسلک کو بالجبر دوسروں پر ٹھونسنا کسی صورت میں درست نہیں۔ ہم اپنی اجتماعیت میں ایک ایسا ماحول پیدا کرنے کی کوشش کریں گے جس میں ان اختلافی مسائل کے بارے میں انتہائی رواداری اور فراخ دلی پائی جائے۔

چھٹی خصوصیت جو قرارداد میں صراحت کے ساتھ مذکور ہو چکی ہے یہ ہے کہ اس میں ''اَلْاَهَمُّ فَالْاَهَمُّ'' کا اصول پیشِ نظر رکھا جائے گا اور تبلیغ و دعوت میں تدریج ملحوظ رہے گی ______ یہ تمام معاملات احادیثِ نبوی ﷺ میں بصراحت مذکور ہیں۔

ساتویں خصوصیت اس اجتماعیت کی جیسا کہ قرارداد سے واضح ہے یہ ہوگی کہ اس کا دائرہ کار صرف مسلمانوں تک محدود نہیں رہے گا بلکہ غیر مسلم بھی اس کے مخاطب ہوں گے۔ مسلمانوں کی خامیوں کی اصلاح بھی ہمارے فرائضِ دینی میں شامل ہے اور غیر مسلموں تک اسلام کی تبلیغ اور ان پر رسالتِ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی جانب سے اتمامِ حجت بھی ہماری دینی ذمہ داریوں میں سے ہے ہماری یہ اسلامی تنظیم ان شاءاللہ اس ضمن میں بھی اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کے لئے کوشاں ہوگی۔

پیشِ نظر تنظیم کی متذکرہ بالا خصوصیات تو وہ ہیں جو ہمارے مابین متفق علیہ ہیں اور ہماری قرارداد میں صراحتاً یا دلالتاً مذکور ہیں۔ اب میں بعض ایسی خصوصیات کا تذکرہ کرنا چاہتا ہوں جو میری ذاتی رائے میں ہمیں اختیار کرنی چاہئیں۔ ان میں اختلاف کی گنجائش تو ہے لیکن مجھے امید ہے کہ ان میں سے اکثر کو آپ حضرات اپنے دل ہی کی آواز محسوس کریں گے۔

ان میں سے پہلی خصوصیت یہ ہے کہ ہمیں اذکار و اوراد کے معاملے میں یہ اُصول متعین کر لینا چاہئے کہ ہم اوراد و وظائف اور اذکار و ادعیہ میں سے صرف ان کو اختیار کریں جو اللہ کی کتاب یا رسول اللہ ﷺ کی سنت سے ماخوذ ہوں۔ ان کا اولین فائدہ تو یہ ہوگا کہ ہم خدا اور رسول ﷺ کے ساتھ جڑے رہیں گے اور اس سے یقیناً ایک عظیم روحانی فائدہ ہوگا، اس کے ساتھ ہی اس سے افتراق و انتشار میں بھی کمی ہوگی۔ مختلف لوگ اپنے ذوق کے اعتبار سے مختلف اذکار اختیار کر لیں تو رفتہ رفتہ یہی ان کی مابہ الامتیاز خصوصیت بن جاتے ہیں اور اس سے ایک علیحدگی کا احساس پیدا ہوسکتا ہے، لہٰذا اس اعتبار سے بھی عافیت اسی میں ہے کہ صرف مسنون اور ماثور ادعیہ و اذکار پر اکتفا کیا جائے۔

دوسری یہ کہ مثبت اور منفی دونوں کام سامنے رکھے جائیں۔ دین میں معروف کے امر کے ساتھ منکر کی نہی کا بھی حکم دیا گیا ہے اور احقاقِ حق کے ساتھ ابطالِ باطل کو بھی لازم ٹھہرایا گیا ہے، آج کل جو عام خیال پھیل گیا ہے کہ صرف مثبت کام کرنا چاہئے منفی کام نہیں کرنا چاہئے تو یہ میری ذاتی رائے میں ازرُوئے دین درست نہیں ہے ______ دعوت کا اچھے سے اچھا اسلوب اختیار کرنا اور حکمتِ تبلیغ کو پیشِ نظر رکھنا بالکل دوسری بات ہے اور انکارِ منکر اور ابطالِ باطل سے قطعاً صرفِ نظر کر کے صرف 'مثبت' باتوں کو پیش کرتے رہنا بالکل دوسری چیز ہے اور دینی غیرت و حمیت کا لازمی تقاضا میرے نزدیک یہ ہے کہ خلافِ دین و شرع امور پر برملا تنقید کی جائے، چاہے اس کا ہدف اصحابِ اقتدار بنتے ہوں چاہے عوام۔ اس معاملے میں یہ پہلو بھی لائقِ توجہ ہے کہ آج کل حکومت کی خلافِ مذہب باتوں پر تنقید کرنے والے تو پھر بھی مل جاتے ہیں، عوام کو ان کی خلافِ دین باتوں پر ٹوکنے والا کوئی نہیں رہا، جبکہ میری ذاتی رائے میں آج کے زمانے میں عوام کو وہی حیثیت حاصل ہے جو کبھی سلاطین و امراء کو حاصل تھی اور اس اعتبار سے ان کی نظری و عملی گمراہیوں اور ضلالتوں پر تنقید بھی ''افضل الجهاد'' کے حکم میں داخل ہوگئی ہے۔

تیسرے یہ کہ جاہلیتِ قدیمہ اور جاہلیتِ جدیدہ دونوں کا ابطال کیا جائے۔ یہ تو ہوسکتا ہے بلکہ غالباً یہی ہو سکتا ہے کہ کچھ لوگ جاہلیتِ قدیمہ کی بیخ کنی کی صلاحیت و قدرت سے مسلح ہوں اور کچھ دوسرے لوگ جاہلیت جدیدہ کے استیصال کی قدرت و طاقت رکھیں۔ چنانچہ انہیں اپنے اپنے محاذوں پر کام کرنا ہوگا لیکن یہ ضروری ہے کہ یہ دونوں محاذ پیشِ نظر رہیں اور کسی سے صرفِ نظر نہ ہونے پائے۔

چوتھی کوشش پیشِ نظر تنظیمِ اسلامی میں اس امر کی ہونی چاہئے کہ نہ تو نری عقلیت پر انحصار کیا جائے اور نہ ہی نری جذباتیت پر دارومدار ہو بلکہ عقل اور جذبے دونوں کو مناسب مقام پر رکھ کر کام کیا جائے جو بات کہی جائے وہ صرف عقلی ہی نہ ہو بلکہ دِل سے بھی نکلے تا کہ اس کے مخاطب اہلِ عقل بھی ہوں اور صاحبانِ دل بھی اور دعوت خود اہلِ عقل کے بھی دل میں گھر کر جائے!

پانچویں لازمی چیز جس کا پورا اہتمام ہماری اس تنظیم میں کیا جانا چاہئے یہ ہے کہ اس میں تنقید پر کوئی پہرا نہ لگایا جائے اور ایسی کوئی پابندی نہ لگائی جائے جس سے لوگوں کی زبانیں بند ہو جائیں۔ تنقید کے صحیح اسلامی آداب کی پابندی تو یقیناً لازم ہے لیکن تنقید کے دروازوں کو بند کر دینا پیشِ نظر تنظیم کی پیشگی ہلاکت کا سامان ہو گا۔ اس تنظیم کے اربابِ حل و عقد کا تنقید کو برداشت کرنے کی ہمت و صلاحیت سے مسلح ہونا ضروری ہے ______ اس کے ساتھ ہی یہ بھی لازمی ہے کہ پیشِ نظر تنظیم کا نظام شورائی ہو اور قرآن حکیم کی اس ہدایت کہ: ''وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ'' کا جیتا جاگتا نمونہ ہو۔

چھٹی خصوصیت ہماری اجتماعیت کی یہ ہونی چاہئے کہ اس میں زہدِ خشک اور تفریح بے قید کے مابین درمیانی کیفیت پیدا ہو اور نہ تو عَبُوْسًا قَمْطَرِيْرًا کا نقشہ پیدا ہو جائے، نہ دوسری انتہا ہو کہ ہر وقت ہنسی دل لگی اور تفریح کا ماحول طاری رہے۔

اسی طرح 'رہبانیت' اور 'تنعّم' کے مابین درمیانی کیفیت کا پیدا کرنا بھی لازمی ہے۔ دین میں نہ قطعی ترک لذات کی ترغیب ہے اور نہ عیش پرستی کی گنجائش ہے۔ اللہ کی نعمتوں سے جائز طریقے سے متمتع ہونے کو بُرا سمجھنا بھی دین کی رُوح کے منافی ہے اور عیش کوشی بھی از روئے دین ممنوع ہے۔

ساتویں ضروری چیز جو قرارداد کی توضیح میں بہت وضاحت کے ساتھ آ چکی یہ ہے کہ انتظامی اور تنظیمی امور میں دلچسپی کے ساتھ اسی درجہ کا گہرا شغف تعبدی امور میں ہونا لازمی ہے ورنہ بالکل یک رُخی شخصیتیں پیدا ہو جاتی ہیں جن کی بدولت دینی تنظیموں میں بہت سی خرابیاں رُونما ہو جاتی ہیں۔ پیشِ نظر تنظیم میں اِن شاء اللہ اس امر کی خصوصی نگہداشت کی جائے گی۔

آٹھویں اور آخری ضروری چیز یہ ہے کہ اپنے زمانے کے مخصوص فتنوں کا صحیح فہم اور ان کی اہمیت کا صحیح شعور حاصل کیا جائے۔ اس معاملے میں دین کے خادموں کو بالکل ماہر تشخیص طبیب کے مانند ہونا چاہئے تاکہ وہ اپنے اپنے زمانے کی اصل اور بنیادی بیماریوں کی صحیح صحیح تشخیص کر سکیں۔ بصورت دیگر یہ ہو سکتا ہے اور بسا اوقات ہوتا ہے کہ ساری جدوجہد علامات کے خلاف ہوتی رہتی ہے اور بیماری کی اصل جڑ جوں کی توں قائم رہتی ہے۔ حضرت صدیقِ اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی نگاہِ حقیقت بین نے بالکل صحیح اندازہ کر لیا تھا کہ منعِ زکوٰۃ وغیرہ جیسے بظاہر 'فروعی' معاملات کی تہہ میں اصل مرض کون سا کام کر رہا ہے۔ اسی طرح حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کی نگاہِ دُوررس نے بھی اپنے وقت کے فتنے کا صحیح اندازہ کر لیا تھا پھر ان کے بعد بھی تمام مجددین اپنے اپنے دَور کے فتنوں کی اہمیت کا اندازہ کر کے ان کے سدّ باب کی سعی کرتے رہے، فجزاھم اللّٰہ خیر الجزاءِ عن جمیع المسلمین اپنے وقت کے امراض کی صحیح تشخیص کے لئے بڑی گہری بصیرت کی ضرورت ہے اور یہ چیز درحقیقت اللہ تعالیٰ کی طرف ہی سے ہوتی ہے۔ تاہم اپنے مقدور بھر اس امر کی سعی ضروری ہے کہ کسی ایک ہی پٹی ہوئی راہ پر چلتے رہنے کے بجائے اس پر مسلسل غور وفکر اور تفکر و تدبر کیا جاتا رہے کہ ہمارے زمانے کے اصل فتنے کون سے ہیں اور ان کے سدّ باب کے لئے صحیح راہ کون سی ہے۔

آخر میں ایک اہم حقیقت کی طرف اشارہ کر کے اپنی معروضات کو ختم کرتا ہوں کہ جو کام کرنے کا عزم ہم نے اللہ تعالیٰ کے فضل سے کیا ہے وہ بیک وقت آسان بھی ہے اور مشکل بھی، آسان اس اعتبار سے کہ یہ ہمارے دین کا تقاضا، ہماری فطرت کی پکار اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ہمارے پروردگار کی جانب سے عائد کردہ فرض ہے۔ لہٰذا اس کی ادائیگی کی سعی و جہد سے دلوں کو راحت اور قلوب کو اطمینان و سکون حاصل ہوگا .... اور مشکل اس اعتبار سے کہ بسا اوقات اس راہ کی مسلسل جدوجہد کا کوئی محسوس نتیجہ برآمد ہوتا نظر نہیں آتا اور انسان کو کمال صبر و استقامت کے ساتھ اپنی محنت کے نتائج وثمرات سے بالکل بے نیاز ہو کر کام کئے جانا پڑتا ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مخاطب ہو کر فرمایا تھا کہ "اے علی! اگر اللہ تیرے ذریعے کسی ایک انسان کو بھی ہدایت کی راہ پر لے آئے تو یہ تیرے لئے سرخ اونٹوں سے بہتر ہے"! بس یہی اس راہ کے ہر مسافر کا ماٹو (Motto) ہونا چاہئے اور اگر اس کے ذریعے اللہ تعالیٰ ایک فرد بشر کو بھی سیدھی راہ پر لے آئے تو اسے چاہئے کہ اس بات کو واقعتاً ایک دولتِ بے بہا اور نعمتِ غیر مترقبہ تصور کرے۔ واقعہ یہ ہے کہ اگر ہمارے قلب ونظر کی کیفیت فی الواقع یہ نہ ہو جائے تو اس راہ میں ثابت قدم رہنا محال ہے۔

آخر میں مَیں اپنے اور آپ سب کے لئے اللہ تعالیٰ سے ہدایت واستقامت اور عفو ومغفرت کی دعا کرتا ہوں۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ○

مولانا اصلاحی کا الوداعی خطاب

عزیز ساتھیو!

اللہ تعالیٰ کی توفیق سے آپ نے ایک جماعتی نظم کے قیام کی قرارداد پر اتفاق کر لیا۔ میں اس پر آپ کو مبارک باد دیتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اس کام کے لئے عزم و ہمت عطا فرمائے، اور ہر قدم پر ہماری دست گیری اور رہنمائی فرمائے ______ میں اس موقع پر آپ کے سامنے یہ اعتراف کرتا ہوں کہ ہر چند اس کی ضرورت اور اہمیت مجھ پر واضح تھی، لیکن میں دو سبب سے اس قسم کی ذمہ داری سے گریز کرتا رہا۔ ایک تو یہ کہ اب میرے قویٰ ضعیف ہو رہے ہیں، کوئی بھاری بوجھ اُٹھانا میرے لئے ممکن نہیں رہا۔ دوسرا یہ کہ زندگی کے اِس آخری دور کے لئے اپنے ذوق کے مناسب جو کام میں نے تجویز کر لیا تھا، اب وقت و فرصت کا لمحہ لمحہ اس پر صرف کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ دوستوں کے شدید اصرار بلکہ دباؤ کے باوجود میں خود اس کے لئے پہل کرنے کی ہمت نہیں کر سکا۔ دوستوں نے جب کبھی اس فریضہ کی اہمیت کی طرف توجہ دلائی، میں ان کے دلائل کا تو انکار نہ کر سکا، لیکن اپنی کمزوریوں اور مجبوریوں پر نگاہ کر کے اُن کی بات کو ٹالتا ہی رہا۔ میں یہ بھی محسوس کرتا رہا کہ اگرچہ میرے اوقات تمام تر دینی وعلمی کاموں ہی میں بسر ہو رہے ہیں، تاہم معاشرے سے متعلق مجھ پر جو فریضہ عائد ہوتا ہے اُس میں مجھ سے کوتاہی ہو رہی ہے، جس کے سبب نہ صرف میری بعض صلاحیتیں سکڑ رہی ہیں، بلکہ اندیشہ اس بات کا ہے کہ اس پر مجھ سے مواخذہ ہو۔ ان تمام احساسات کے باوجود میں اپنے آپ کو معذور سمجھتا رہا، جس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ آدمی اپنے آپ کو معذور سمجھنے میں بڑا فیاض ہوتا ہے۔

بہر حال اب میں پورے شرحِ صدر کے ساتھ اس کام میں شریک ہوتا ہوں اور اُن تمام دوستوں کا دل

سے شکر گزار ہوں جنہوں نے اس عظیم فرض کی اہمیت کو سمجھا اور ہم سب کو اس کے سمجھانے کا اہتمام کیا۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کی طرف سے ان کو جزائے خیر عطا فرمائے۔

میرے ذمہ اس وقت آپ تمام شرکائے مجلس کو بعض ضروری ہدایات دینے کا کام سپرد کیا گیا ہے۔ یہ ہدایات ان کاموں سے متعلق ہیں جو آپ کو یہاں سے رخصت ہونے کے بعد کرنے ہیں، براہ کرم ان کو نوٹ کر لیجئے۔

جماعتی تنظیم سے متعلق اس وقت آپ کو پہلا کام یہ کرنا ہے کہ تنظیم کے نظام و دستور سے متعلق آپ کے سامنے جو تجویزیں ہیں وہ مقامی رفقاء سے مشورہ کے بعد قلم بند کر کے شیخ سلطان احمد صاحب کے پاس بھیج دیجئے تا کہ مجلسِ مشاورت اُن سے فائدہ اٹھا سکے ______ حتی الوسع اس بات کی کوشش کیجئے کہ تجاویز کے بارے میں اگر اختلاف رائے ہو تو وہ غور و بحث سے مقامی رفقاء ہی کے اندر طے ہو جائے، تاکہ آگے کا کام آسان ہو جائے۔ اگر غور و بحث کے بعد بھی کسی امر میں اختلاف باقی رہ جائے تو اس کو نوٹ کر دیا جائے۔

اپنی اور اپنے دوسرے بھائیوں کی اصلاح و تربیت سے متعلق جو کام آپ کو کرنے ہیں ان کے بارے میں مفصل ہدایات تو افرادی قوت کا جائزہ لینے کے بعد ہی دی جاسکیں گی لیکن چند کام ایسے ابتدائی اور بدیہی نوعیت کے ہیں کہ ان کا اہتمام بلا تاخیر آپ کو کرنا چاہئے۔

پہلا کام نماز کا اہتمام ہے۔ نماز ہمارے دین میں ایمان کا اوّلین تقاضا ہے۔ قرآن و حدیث سے یہ بات ثابت ہے کہ اسلامی تنظیم کی شیرازہ بندی اسی چیز سے ہوتی ہے، اور انبیاء علیہم السلام نے اصلاح و تربیت کا پہلا قدم اسی سے اٹھایا ہے۔ آپ بھی اس کی پابندی کے لئے مضبوط عہد کیجئے اور اپنے عزیزوں، قریبوں، دوستوں، پڑوسیوں اور محلّہ داروں کو بھی دلسوزی اور خیر خواہی کے ساتھ اس کی تلقین کیجئے۔ نماز کے اہتمام میں یہ بات بھی داخل ہے کہ حتی الوسع محلّہ کی مسجد میں جماعت کے ساتھ نماز ادا کیجئے۔ بغیر کسی معقول عذر کے اس میں کوتاہی نہ کیجئے اور دوسروں کو بھی نماز باجماعت کی عظمت و اہمیت سمجھانے کی کوشش کیجئے!!

دوسرا کام یہ ہے کہ اپنے دینی علم میں اضافہ کا اہتمام کیجئے۔ جن مقامات پر یہ ممکن ہو کہ کسی ذی علم کی رہنمائی میں قرآن مجید کا اجتماعی مطالعہ کیا جاسکے، وہاں حلقہ تدبرِ قرآن قائم کیجئے اور ہفتہ میں کم از کم ایک دن اس کام کے لئے خاص کیجئے کہ کچھ وقت قرآن کے فکر و مطالعہ میں بسر ہو۔ اس کے ساتھ اگر حدیث کی ایسی کتابوں کا مطالعہ بھی کیا جائے جو اخلاقی احادیث پر مشتمل ہیں مثلاً ریاض الصالحین وغیرہ تو اس سے مزید خیر و برکت ہوگی۔ اگر کسی ذی علم کی رہنمائی حاصل نہ ہو تو عام حلقہ مطالعۂ اسلامی قائم کیجئے اور منتخب اسلامی کُتب کا التزام سے مطالعہ کیجئے۔ اس قسم کے حلقہ میں اپنے اُن دینی بھائیوں کو بھی شرکت کی دعوت دیجئے جن کے اندر دین اور علمِ دین کی رغبت محسوس کریں۔

آپ لوگوں میں سے جن لوگوں نے جدید تعلیم پائی ہو، اُن کو میں یہ مشورہ بھی دُوں گا کہ وہ عربی زبان سیکھنے کی کوشش کریں، تاکہ وہ قرآن و حدیث سے براہ راست استفادہ کر سکیں۔ بظاہر یہ کام مشکل نظر آتا ہے لیکن شوق اور طلب سے ہر مشکل آسان ہو جاتی ہے۔ اپنے اپنے شہروں میں جس عالم سے بھی اس کام میں آپ کو مدد ملنے کی توقع ہو اس سے استفادہ کیجئے۔ ہم خود بھی حالات کا جائزہ لینے کے بعد اس مسئلہ پر غور کریں گے کہ آسان طریقہ سے آپ کو عربی سکھانے کی کیا شکل اختیار کی جاسکتی ہے۔ لاہور میں اس سلسلہ میں ہم نے جو تجربے کئے ہیں، ہم ان سے بھی آپ کو آگاہ کریں گے تاکہ جن مقامات پر اس نہج پر درس جاری ہو سکے وہاں اس نہج پر درس کئے جائیں۔

تیسرا کام یہ ہے کہ اپنے اپنے مقامات پر اپنے ہم خیال اور رفیق تلاش کیجئے جن کے تعاون سے پیشِ نظر مقصد کو تقویت حاصل ہو۔ جو اس جدوجہد میں آپ کے لئے سہارا بن سکیں، جو آپ کی اصلاح کریں، اور جن کی آپ اصلاح کریں۔ جماعتی زندگی کی یہی خیر و برکت ہے جو انفرادی زندگی میں حاصل نہیں ہوسکتی۔ اگرچہ یہ زمانہ بہت بُرا ہے لیکن اِس بُرے زمانے میں بھی اچھی رُوحیں اور نیک نفوس موجود ہیں، ضرورت ٹٹولنے اور جستجو کی ہے۔ جب آپ جستجو کریں گے تو اللہ کے بے شمار بندے ایسے مل جائیں گے جو آپ کی رفاقت کے لئے اُٹھ کھڑے ہوں گے۔ کتنے نفوس ہوتے ہیں جن کے اندر دینی حِس موجود ہوتی ہے، لیکن کوئی اُس کو اُکسانے والا نہیں ہوتا، اس وجہ سے وہ دبی ہوئی رہتی ہے۔ آپ ایسے نفوس تلاش کیجئے، اُن تک پہنچئے، اُن سے تبادلۂ خیالات کیجئے، اور اس کام میں اُن کو تعاون کی دعوت دیجئے۔

آپ کی اجتماعی طاقت جتنی ہی بڑھتی جائے گی اتنی ہی ان کاموں کی انجام دہی آپ کے لئے آسان ہوتی جائے گی۔ جو افراد اور معاشرہ کی اصلاح سے متعلق آپ پیشِ نظر رکھتے ہیں۔

یہ چند ابتدائی کام ہیں جو اس قرارداد کی روشنی میں، جو آپ نے پاس کی ہے، فی الفور شروع کئے جاسکتے ہیں۔ آگے اللہ مزید کاموں کی راہیں کھولے گا، اگر ہمارے اندر اس کے دین کی خدمت کے لئے اخلاص ہو گا۔ اب دُعا کیجئے کہ ہمیں اس کام کے لئے سچا عزم حاصل ہو اور ہر قدم پر توفیقِ الٰہی ہماری رہنمائی فرمائے۔

تائید وتبصرہ

۱. مولانا عَبدُالماجِدُ دَریابادیؒ مرحوم

ایک نیا اصلاحی ادارہ

''لاہور کے ایک معزز دینی ماہنامہ 'میثاق' سے یہ معلوم کر کے دِلی خوشی ہوئی کہ وہاں چند ذی فہم وبصیرت مخلصوں کی سعی واہتمام سے ایک نئے دینی ادارہ کی بنیاد بالکل صحیح اُصول پر پڑ رہی ہے۔ یہ حضرات زیادہ تر جماعت اسلامی سے نکلے ہوئے ارکان ہیں اور یقین ہے کہ یہ ان شاء اللہ ان غلطیوں سے محفوظ رہیں گے، جن کا خوب تجربہ انہیں جماعت مذکور میں شامل رہ کر ہو چکا ہے۔ ادارہ کے ایک بانی مولانا امین احسن اصلاحی کی یہ بات آب زر سے لکھنے کے قابل ہے:

''جماعتیں اور تنظیمیں قائم تو ہوتی ہیں اصلاً کسی اعلیٰ و برتر نصب العین کے لئے لیکن قائم ہوجانے کے بعد وہ رفتہ رفتہ از خود نصب العین اور مقصد بن جاتی ہیں اور اصل نصب العین غائب ہوجاتا ہے!''

یہ 'صدق' کے مسلک کی صدفی صد ترجمانی ہے۔ مولانا اصلاحی کی تقریر کا یہ ٹکڑا بھی خصوصی اہمیت کا حامل ہے:

''ارباب اقتدار کی ہر بات کو ہدفِ تنقید بنا لینا، یہاں تک کہ اُن کے خیر کو بھی شر قرار دے لینا، اور اُس کی مخالفت میں اِس حد تک بڑھ جانا کہ دوسروں کی بُرائیاں بھی اُن کے کھاتے میں ڈال دینا نہ عقل ومنطق کی رُو سے جائز ہے، اور نہ اسلام کی رُو سے۔ یہ اقتدار کی ہوس میں اندھے ہو جانے کی علامت ہے!''

اور پاکستان کی (ہندوستان نہیں) جماعتِ اسلامی کو شدید ترین نقصان شاید اسی چیز نے پہنچایا ہے۔ اللہ ہم کو پچھلی غلطیوں سے سبق لینے کی توفیق دے اور راہِ اصلاح وہدایت پر مستقیم رکھے۔''

خدمتِ دین کی گنجائشیں

پاکستان کے دینی ماہنامہ 'میثاق' لاہور سے نئی دینی واجتماعی تنظیم کے سلسلے میں:

''آخر میں اس امر کی وضاحت بہت ضروری ہے کہ پیشِ نظر تنظیم ہرگز ''الجماعت'' کے حکم میں داخل نہ ہوگی۔ ''الجماعت'' کا مقام ہماری دانست میں اُمت مسلمہ کو بحیثیت مجموعی حاصل ہے۔ دین کی خدمت ایک نہایت وسیع وعریض کام ہے اور اس کے گوشے بے شمار ہیں۔ ہم ان تمام جماعتوں اور اداروں کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں جو کسی بھی گوشے میں دین کی خدمت کا کام کر رہی ہیں اور ان شاء اللہ اُن کے ساتھ ہمارا رویہ تعاون وتائید ہی کا ہوگا!''

بات اصلاً بہت موٹی اور بالکل صاف وواضح ہے، لیکن اس زمانے میں بہت بڑی بات ہے۔ دین و اُمّت کی خدمت کے اتنے پہلو ہیں اور خدمت کے لئے گنجائش اتنی ہے کہ اگر نفسانیت کو چھوڑ کر تھوڑے سے بھی عزم وحوصلہ کے ساتھ خدمت کا ارادہ ہو تو خلوص اور فہمِ سلیم سے کام لینے والا ہر فردِ اُمت اس کے اندر کھپ سکتا ہے اور باہمی مناقشہ سے جو اب تک بڑا سنگِ راہ بنا ہوا ہے' نجات پا کر ہر گروہ اپنے مذاق واستعداد کے لحاظ سے سچا خادمِ دین بن سکتا ہے!'' (میثاق۔ لاہور' جنوری ۶۸ء بحوالہ ''صدقِ جدید'' ۱۷ نومبر ۶۷ء)

۲. مولانا عَبدُالباریؒ ندوِی مرحوم

فرنگی ساخت کی جماعت سازی اور اُس کی فتنہ سامانی!

''تازہ میثاق میں زیادہ تر پرانی جماعتِ اسلامی سے علیحدہ ہونے والے حضرات جو ایک نئی جماعت بنا رہے ہیں اور جس کا ہمارے حضرت صاحبِ 'صدق' نے بھی خیر مقدم کیا ہے، اس کی تفصیلات معلوم ہوئیں۔ آپ کی تقریر کی جس بات کی صاحبِ صدق نے داد دی ہے، میں بھی اُسے ہی سب سے زیادہ قابلِ داد اور آبِ زر کیا، آپِ جواہر سے لکھنے کے قابل پاتا ہوں۔ میں تو فرنگی ساخت کی جماعت سازیوں کے عین خمیر ہی میں اس فساد کو داخل جانتا ہوں اور علی الاعلان کہا کرتا ہوں کہ یہ افتراق سازی کی بنیاد ہوتی ہے۔ انبیاء کا طریق یہ ہے کہ صاحبِ دعوت وعزیمت اپنی دعوت لے کر کھڑا ہوتا ہے اور بلا کسی مصنوعی جماعت سازی کے جو لوگ برضا ورغبت اِس کے ساتھ شریک ہوتے ہیں، بس وہی ''حزبُ اللہ'' بن جاتے ہیں اور قواعد وضوابط اور کثرتِ رائے وغیرہ کی بحث کے بغیر جب تک وہ داعی کے ساتھ چلتے رہتے ہیں تبھی خیریت رہتی ہے۔ باقی جہاں اقلیت واکثریت وغیرہ کی رائے شماری اور صدر وسیکرٹری اور چندہ بازی وغیرہ کے جدید فرنگی طریقے داخل ہوئے، بس پھوٹ یقینی ہے کہ ایسی صورت میں جیسا آپ نے بالکل صحیح لکھا ہے (بالکل نفسیاتی طور پر) جماعت مقصود بن جاتی ہے اور اصل مقصود غائب ہوتے ہوتے بمنزلۂ صفر ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ جب تک غیر معمولی اخلاص ولِلّٰہیّت کم وبیش تمام افرادِ جماعت میں نہ ہوں، جماعتی عصبیت ورقابت اس جماعت سازی کا لازمہ ہے۔ مجھے تو ہمیشہ الٰہ آباد کے عارفِ اکبر کا یہ عارفانہ شعر برابر یاد آتا رہتا ہے، جس کے ذریعے اِس طرز کی جماعت سازیوں کے آغاز ہی میں انہوں نے آگاہ فرما دیا تھا: ؎

کریما بہ بخشائے برحالِ بندہ
کہ ہستم اسیرِ کمیٹی و چندہ!

اور یہ سراپا ناکارہ..... اور....... کے حضرات سے یہی عرض کرتا رہتا ہے کہ اپنی جماعتوں کو توڑ دیں کہ اُن میں سے انجام کسی ایک کا بھی بخیر نہ ہوا تو بالآخر صدارت کو دو صدروں میں تقسیم کرنا پڑا!''

(مولانا اصلاحی کے نام ایک خط سے ماخوذ)

حصّہ دوم

عقائد

یا

بنیادی تصورات

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تنظیم اسلامی کے بنیادی دینی تصورات ــــــ یعنی عقائد ــــــ اہل سنت والجماعت کے مطابق ہیں، جن کی رُو سے: ہر عاقل و بالغ مسلمان خواہ وہ مرد ہو یا عورت، پر لازم ہے کہ وہ:

(ا) پورے شعور و ادراک کے ساتھ اقرار کرے کہ:

"اٰمَنْتُ بِاللّٰہِ کَمَا ھُوَ بِاَسْمَائِہٖ وَصِفَاتِہٖ وَقَبِلْتُ جَمِیْعَ اَحْکَامِہٖ، اِقْرَارٌ ۢبِاللِّسَانِ وَتَصْدِیْقٌ بِالْقَلْبِ"

یعنی میں یقین رکھتا ہوں اللہ پر جیسا کہ وہ اپنے اسماء وصفات سے ظاہر ہے اور قبول کرتا ہوں اس کے جملہ احکام، اقرار کرتا ہوں زبان سے اور تصدیق کرتا ہوں دل سے! ــــ اور

"اٰمَنْتُ بِاللّٰہِ وَمَلٰئِکَتِہٖ وَکُتُبِہٖ وَرُسُلِہٖ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْقَدْرِ خَیْرِہٖ وَشَرِّہٖ مِنَ اللّٰہِ تَعَالٰی وَالْبَعْثِ بَعْدَ الْمَوْتِ"

یعنی میں یقین رکھتا ہوں اللہ پر، اور اس کے فرشتوں پر، اور اس کی کتاب پر، اور اس کے رسولوں پر، اور یوم آخر پر، اور تقدیر پر کہ اس کی بھلائی اور بُرائی سب اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے ہے اور مرنے کے بعد جی اُٹھنے پر۔

تشریح: اسلام کی اساس ایمان پر قائم ہے اور ایمان کی تعبیر کے لئے ایمان مجمل اور ایمان مفصّل کے مندرجہ بالا الفاظ جو سلف سے منقول ہیں، حد درجہ موزوں بھی ہیں اور نہایت جامع و مانع بھی۔ اس لئے کہ ان میں ایمانیات کی تفصیل کے علاوہ دو اہم اور بنیادی نکتے بھی واضح ہو جاتے ہیں۔ ایک یہ کہ ایمان زبانی اقرار (جو اُس قانونی ایمان یعنی اسلام کا رکن اولین ہے جس پر تمام دنیوی معاملات کا دارومدار ہے اور جس پر اسلامی ہیئت اجتماعی کی بنیاد قائم ہوتی ہے) اور تصدیق قلبی (جس پر اُس حقیقی ایمان کا دارومدار ہے جس کی بناء پر آخرت میں کوئی شخص مومن قرار پائے گا) دونوں کا مجموعہ ہے اور دوسرے یہ کہ علمی ونظری اور اصولی اعتبار سے ایمان حقیقتاً ایمان باللہ ہی کا نام ہے۔ بقیہ تمام ایمانیات اسی اصل کی فروع اور اسی اجمال کی تفصیل ہیں۔ چنانچہ ایمان بالآخرت بھی اللہ تعالیٰ کی صفاتِ حکمت وعدل کا مظہر ہے اور ایمان بالرسالت بھی اس کی صفاتِ ربوبیت وہدایت ہی کی توسیع۔

اللہ وہ زندہ جاوید ہستی ہے جو ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا ــــ وہ اَلْاَحَدُ ہے یعنی ہر اعتبار سے تنہا اور اکیلا، چنانچہ نہ کوئی اس کی ذات میں شریک ہے نہ صفات میں، نہ حقوق میں نہ اختیارات میں، نہ اس کا کوئی ہم جنس ہے نہ ہم کفو، نہ ہم سر ہے نہ ہم پلّہ، نہ ضد ہے نہ ندّ نہ مثل ہے نہ مثال ــــ وہ الصَّمَد ہے یعنی وہ

پورے سلسلہ کون ومکان کا مبدع بھی ہے اور موجد بھی، خالق بھی ہے اور باری بھی، صانع بھی ہے اور مصور بھی اور اسی کی توجہ وعنایت اسے تھامے ہوئے بھی ہے اور قائم کئے ہوئے بھی۔

وہ پاک اور منزہ ومبرا ہے ہر عیب، ہر نقص، ہر کمی، ہر ضعف، ہر احتیاج، ہر غلطی اور ہر کوتاہی سے، گویا وہ سبوح بھی ہے اور القدوس بھی ____ اور جامع ہے تمام محاسن وکمالات کا، اور ہر خیر اور خوبی کا بدرجہ تمام وکمال، گویا وہ الغنی بھی ہے اور الحمید بھی، کسی کو کوئی قوت وطاقت حاصل نہیں بجز اس کے اذن واجازت کے، گویا وہی، العلی بھی ہے اور العظیم بھی اور المتعال بھی ہے اور الکبیر، المتکبر بھی۔ ''سُبْحَانَ اللّٰهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ وَلَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاللّٰهُ اَكْبَرُ وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيْمِ'' اس کی ذات وراءُ الوراء ثم وراءُ الوراء ہے اور اس کی ماہیت اور کنہ کو کوئی نہیں جان سکتا اور اس کی معرفت کی واحد راہ اس کے اسماء وصفات کے واسطے ہی سے ہے۔ چنانچہ تمام اچھے نام اسی کے ہیں اگرچہ متعین طور پر اس کے اسماءِ حسنیٰ وہی ہیں جو قرآن اور حدیث نبویؐ میں وارد ہوئے ____ اسی طرح وہ تمام صفات کمال سے بتمام وکمال متصف ہے جن میں سے اہم ترین آٹھ ہیں یعنی (۱) حیات، (۲) علم، (۳) قدرت، (۴) ارادہ، (۵) سمع، (۶) بصر، (۷) کلام اور (۸) تکوین، چنانچہ وہی الحی بھی ہے اور القیوم بھی اور السمیع بھی ہے اور البصیر بھی ﴿عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ﴾ بھی ہے اور ﴿بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ﴾ بھی ﴿فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ﴾ بھی ہے اور ﴿اِنَّمَآ اَمْرُهٗٓ اِذَآ اَرَادَ شَيْئًا اَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ﴾ کی شان کا حامل بھی ____ مزید برآں اس کی جملہ صفات اس کی ذات ہی کے مانند مطلق ولامتناہی ہیں نہ کہ محدود ومقید، اور قدیم ہیں نہ کہ حادث اور ذاتی ہیں نہ کہ کسی اور کی عطا کردہ۔

فرشتے وہ برگزیدہ ہستیاں ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے نور سے تخلیق فرمایا۔ وہ صاحبِ تشخص وجود کے حامل ہیں نہ کہ مجرد قوائے طبعیہ، ان کا نہ مذکر ہونا معلوم ہے نہ مونث، وہ خدا سے قرب ضرور رکھتے ہیں لیکن الوہیت میں ان کا کوئی حصہ نہیں، وہ اللہ کے حکم کے خلاف کچھ نہیں کرتے اور وہی کرتے ہیں جس کا حکم انہیں بارگاہِ خداوندی سے ملے، وہ اللہ کے احکام کی تنفیذ بھی کرتے ہیں اور خالق ومخلوق کے مابین پیغام رسانی بھی، چنانچہ وہی انبیاء ورُسل تک وحی لاتے رہے ہیں، ان کی تعداد بے شمار ہے لیکن چار بہت مشہور بھی ہیں اور جلیل القدر بھی۔ یعنی حضرت جبرائیل، حضرت میکائیل، حضرت اسرافیل اور حضرت عزرائیل علیہم السلام۔

اللہ کی کتابوں میں سے بھی چار ہی معلوم ومعروف ہیں، یعنی توراۃ جو حضرت موسیٰ کو عطا ہوئی اور زبور جو حضرت داؤدؑ کو عطا ہوئی اور انجیل جو حضرت عیسیٰؑ کو عطا ہوئی اور قرآن جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا ہوا، جو اللہ کی آخری کتاب اور نوعِ انسانی کے نام اللہ کا آخری اور مکمل پیغام ہے، جس کے بعد کوئی اور کتاب نازل نہ ہوگی اور جو من وعن محفوظ موجود ہے اور ہمیشہ رہے گا جبکہ باقی تینوں کتابیں ردوبدل اور تغیر وتحریف کا ہدف بن چکی ہیں، گویا اب قرآن ہی اُن کا مصدق بھی ہے اور مھیمن بھی ____ ان کے علاوہ اور بھی بہت سے پیغمبروں کے صحیفے عطا ہوئے جن میں سے کچھ اب دنیا میں سرے سے موجود ہی نہیں ہیں، باقی محرف اور مبدل ہیں۔

اللہ کے رسول نوعِ انسانی کے وہ برگزیدہ افراد ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے بنی آدم تک اپنا پیغام پہنچانے کے لئے وقتاً فوقتاً چنا اور پسند فرمایا۔ وہ انسانیت کا اعلیٰ ترین نمونہ تھے اور سب گناہ سے پاک یعنی معصوم تھے، ان کی تعداد اللہ ہی کو معلوم ہے، قرآن مجید میں جن کے نام مذکور ہیں ان کے سوائے کسی اور کو یقین کے ساتھ نبی یا رسول قرار نہیں دیا جاسکتا۔ ان میں سے پانچ حد درجہ اولوالعزم اور نہایت عالی مرتبہ ہیں یعنی حضرت نوح علیہ السلام، حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت موسیٰ علیہ السلام، حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم ___ ان میں سے بعض کو بعض پر بعض پہلوؤں سے جزوی فضیلت حاصل ہے لیکن جملہ انبیاء ورُسل پر فضیلت کُلی سید ولد آدم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل ہے، جو خاتم النبیین بھی ہیں اور آخر الرسل بھی اور جن کے بعد وحی نبوت کا دروازہ ہمیشہ کے لئے کُلی طور پر بند ہو چکا ہے۔

انبیاء ورُسل کی تائید وتقویت کے لئے اللہ تعالیٰ عام مادی ضوابط کو عارضی طور پر معطل کر کے گویا عادی قانون کو توڑ کر اپنی آیات ظاہر کرتا اور معجزات دکھاتا رہا ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی بے شمار حسی معجزے عطا ہوئے لیکن آپ کا اہم ترین اور عظیم ترین معجزہ معنوی ہے یعنی قرآن حکیم۔

یوم آخر وہ دن ہے جس میں تمام انسان دوبارہ زندہ ہو کر عدالت خداوندی میں محاسبے اور جزا وسزا کے فیصلے کے لئے پیش ہوں گے جس کے نتیجے میں یا جنت میں داخلہ ہوگا یا جہنم میں ____ اس دن اقتدار مطلق اور اختیار کلی صرف اللہ واحد وقہار کے ہاتھ میں ہوگا نہ کسی کو کسی جانب سے کوئی مدد مل سکے گی، نہ کوئی کچھ دے دلا کر چھوٹ سکے گا، نہ کوئی سفارش ہی خدا کی پکڑ سے بچا سکے گی۔ انبیاء ورُسل، صلحاء واتقیاء، ملائکہ وارواح اور سب سے بڑھ کر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مراتب عالیہ کے اظہار واعلان اور ان کے اعزاز واکرام کے لئے شفاعت کی اجازت دی جائے گی اور گناہ گار اہل ایمان کے حق میں ان کی شفاعت قبول بھی ہوگی لیکن نہ وہ خدا کی مرضی اور منشاء کے خلاف کچھ کہیں گے اور نہ ہی خدا کی صفت عدل باطل ہوگی۔

تقدیر کے خیر وشر کا من جانب اللہ ہونا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ قادر مطلق ہے اور مخلوقات میں سے کسی کے بس میں نہیں کہ بغیر اس کی اجازت محض اپنے ارادے سے کچھ کر سکے۔ لہٰذا یہاں جو کچھ ظہور پذیر ہوتا ہے خواہ وہ کسی کو بھلا لگے یا بُرا، اللہ کے اذن ہی سے ہوتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو خدا کا عاجز ولاچار ہونا لازم آتا ہے۔ مزید برآں، وہ ''عَالِمُ مَا كَانَ وَمَا يَكُوْنَ'' بھی ہے۔ چنانچہ اس پورے سلسلہ کون ومکان میں جو کچھ ماضی میں ہوا، یا حال میں ہو رہا ہے یا مستقبل میں ہوگا سب اس کے علم قدیم میں پہلے سے موجود ہے، اگرچہ اس کا یہ علم

جبرِ محض کو مستلزم نہیں ___ گویا، ایمان بالقدر، دراصل اللہ تعالیٰ کی دو صفات یعنی قدرت اور علم کے مضمرات اور مقدرات ہی کو ماننے کا نام ہے۔

بعث بعد الموت سے مراد یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کا حکم ہوگا نفخۂ اُولیٰ ہوگا جس کے نتیجے میں کائنات کا پورا موجودہ نظام درہم برہم ہو جائے گا اور سب پر ایک عمومی موت طاری ہو جائے گی۔ پھر جب اللہ کا اذن ہوگا نفخۂ ثانیہ ہوگا اور سب جی اُٹھیں گے اور حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر تا قیامِ قیامت پیدا ہونے والے آخری انسان تک سب میدان حشر میں جمع کئے جائیں گے!

(ب) کلمہ طیبہ "لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ" کے جملہ مضمرات ومقدرات کے فہم وشعور کے ساتھ گواہی دے کہ:

"اَشْهَدُ اَنْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ"

یعنی میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوائے کوئی معبود نہیں، وہ تنہا ہے اور اس کا کوئی شریک نہیں اور میں گواہی دیتا ہوں کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس کے بندے اور رسول ہیں۔

تشریح: اس شہادت کے جزو اوّل کا مطلب یہ ہے کہ زمین اور آسمان اور جو کچھ آسمان وزمین میں ہے سب کا خالق، پروردگار، مالک اور تکوینی وتشریعی حاکم صرف اللہ ہے، ان میں سے کسی حیثیت میں بھی کوئی اس کا شریک نہیں ہے۔ گویا "اَ لَا لَهُ الخَلقُ وَالْاَمْرُ" اور "لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ"۔

اس حقیقت کو جاننے اور تسلیم کرنے سے لازم آتا ہے کہ:

۱۔ انسان اللہ کے سوا کسی کو ولی وکارساز، حاجت روا اور مشکل کشا، فریاد رس اور حامی وناصر نہ سمجھے، کیونکہ کسی دوسرے کے پاس کوئی اقتدار ہے ہی نہیں۔

۲۔ اللہ کے سوا کسی کو نفع یا نقصان پہنچانے والا نہ سمجھے، کسی سے تقویٰ اور خوف نہ کرے، کسی پر توکل نہ کرے، کسی سے اُمیدیں وابستہ نہ کرے، کیونکہ تمام اختیارات کا مالک تنہا وہی ہے۔

۳۔ اللہ کے سوا کسی سے دُعا نہ مانگے، کسی کی پناہ نہ ڈھونڈے، کسی کو مدد کے لئے نہ پکارے۔ کسی کو خدائی انتظامات میں ایسا دخیل اور زورآور بھی نہ سمجھے کہ اس کی سفارش قضائے الٰہی کو ٹال سکتی ہو، کیونکہ خدا کی سلطنت میں سب بے اختیار رعیت ہیں، خواہ فرشتے ہوں یا انبیاء یا اولیاء۔

۴۔ اللہ کے سوا کسی کے آگے سر نہ جھکائے، کسی کی پرستش نہ کرے، کسی کو نذر نہ دے اور کسی کے ساتھ وہ معاملہ نہ کرے جو مشرکین اپنے معبودوں کے ساتھ کرتے رہے ہیں، کیونکہ تنہا ایک اللہ ہی عبادت کا مستحق ہے۔

۵۔ اللہ کے سوا کسی کو بادشاہ، مالک الملک اور مقتدر اعلیٰ تسلیم نہ کرے، کسی کو باختیار خود حکم دینے اور منع کرنے کا مجاز نہ سمجھے، کسی کو مستقل، بالذات شارع اور قانون ساز نہ مانے اور اُن تمام اطاعتوں کو قبول کرنے سے انکار کر دے جو ایک اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے تحت اور اُس کے قانون کی پابندی میں نہ ہوں، کیونکہ اپنے ملک کا ایک ہی جائز مالک اور اپنی خلق کا ایک ہی جائز حاکم اللہ ہے۔ اس کے سوا کسی کو مالکیت اور حاکمیت کا حق نہیں پہنچتا۔ نیز اس عقیدے کو قبول کرنے سے یہ بھی لازم آتا ہے کہ:

۶۔ انسان اپنی آزادی وخود مختاری سے دست بردار ہو جائے، اپنی خواہش نفس کی بندگی چھوڑ دے اور اللہ کا بندہ بن کر رہے جس کو اس نے الٰہ تسلیم کیا ہے۔

۷۔ اپنے آپ کو کسی چیز کا مالک مختار نہ سمجھے، بلکہ ہر چیز حتیٰ کہ اپنی جان، اپنے اعضاء اور اپنی ذہنی اور جسمانی قوتوں کو بھی اللہ کی مِلک اور اس کی طرف سے امانت سمجھے۔

۸۔ اپنے آپ کو اللہ کے سامنے ذمہ دار اور جواب دہ سمجھے اور اپنی قوتوں کے استعمال اور اپنے برتاؤ اور تصرفات میں ہمیشہ اس حقیقت کو ملحوظ رکھے کہ اُسے قیامت کے روز اللہ کو ان سب چیزوں کا حساب دینا ہے۔

۹۔ اپنی پسند کا معیار اللہ کی پسند کو اور اپنی ناپسندیدگی کا معیار اللہ کی ناپسندیدگی کو بنائے۔

۱۰۔ اللہ کی رضا اور اس کے قرب کو اپنی تمام سعی وجہد کا مقصود اور اپنی پوری زندگی کا محور ٹھہرائے۔ گویا اللہ تعالیٰ ہی اس کا محبوب حقیقی اور مطلوب ومقصود اصلی بن جائے۔

۱۱۔ اپنے لئے اخلاق میں، برتاؤ میں، معاشرت اور تمدن میں، معیشت اور سیاست میں، غرض زندگی کے ہر معاملے میں صرف اللہ کی ہدایت کو ہدایت تسلیم کرے اور ہر اُس طریقے اور ضابطے کو رد کر دے جو اللہ کی شریعت کے خلاف ہو۔

اس شہادت کے جزو ثانی سے واضح ہوتا ہے کہ سیدِ وُلدِ آدم نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دو حیثیتیں ہیں۔ ایک یہ کہ آپؐ اللہ کے بندے ہیں اور دوسرے یہ کہ آپؐ اللہ کے رسول ہیں۔ پہلی حیثیت کے اعتبار سے آپ عبدیت کاملہ کے مقام پر فائز ہیں اور آپؐ کی اس حیثیت کے علم اور اعتراف سے شرک کی ان جملہ اقسام کا کامل سدّ باب ہو جاتا ہے جن میں سابقہ اُمتیں اپنے اپنے انبیاء ورُسل کے فرطِ احترام، شدّتِ عقیدت اور غلو محبت کے باعث ملوث ہوگئیں اور دوسری حیثیت کے اعتبار سے آپؐ کے فرقِ مبارک پر ختم نبوت اور ختمِ رسالت کا تاج بھی ہے اور آپ کے دستِ مبارک میں شہنشاہِ ارض وسماء کی جانب سے اِتمامِ نعمتِ شریعت اور تکمیل دینِ حق کا فرمانِ شاہی بھی۔ گویا سلطانِ کائنات کی طرف سے رُوئے زمین پر بسنے والے انسانوں کو جس آخری نبیؐ کے ذریعہ سے مستند ہدایت نامہ اور ضابطہ قانون بھیجا گیا اور جس کو اس ضابطہ کے مطابق کام

کر کے ایک مکمل نمونہ قائم کر دینے پر مامور کر دیا گیا، وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔

اس امر واقعی کو جاننے اور تسلیم کرنے سے لازم آتا ہے کہ انسان کو جملہ مخلوقات میں شدید ترین محبت آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی سے ہو اور آپؐ کی اطاعت اور اتباع ہی زندگی کا اصل طریق بن جائے گویا:

۱۔ انسان ہر اُس تعلیم اور ہر اُس ہدایت کو بے چون و چرا قبول کرے جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہو۔

۲۔ اس کو کسی حکم کی تعمیل پر آمادہ کرنے کے لئے اور کسی طریقہ کی پیروی سے روک دینے کے لئے صرف اتنی بات کافی ہو کہ اس چیز کا حکم یا اس چیز کی ممانعت رُسولِ خدا سے ثابت ہے۔

۳۔ رسولِ خدا کے سوا کسی کی مستقل بالذات پیشوائی و رہنمائی تسلیم نہ کرے۔ دوسرے انسانوں کی پیروی کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کے تحت ہو، نہ کہ ان سے آزاد۔

۴۔ اپنی زندگی کے ہر معاملے میں خدا کی کتاب اور اُس کے رسولؐ کی سُنّت کو حجت اور سند اور مرجع قرار دے، جو خیال یا عقیدہ یا طریقہ کتاب وسنت کے مطابق ہوا سے اختیار کرے، جو اس کے خلاف ہو اسے ترک کر دے، اور جو مسئلہ بھی حل طلب ہوا سے حل کرنے کے لئے اُسی سر چشمہ ہدایت کی طرف رجوع کرے۔

۵۔ تمام عصبیتیں اپنے دل سے نکال دے خواہ وہ شخصی ہوں یا خاندانی یا قبائلی و نسلی، یا قومی و وطنی، یا فرقی و گروہی، کسی کی محبت یا عقیدت میں ایسا گرفتار نہ ہو کہ رسولؐ خدا کے لائے ہوئے حق کی محبت وعقیدت پر وہ غالب آجائے یا اس کی مدِّ مقابل بن جائے۔

۶۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد پیدا ہونے والے کسی شخص کو نہ تو کسی بھی معنی میں نبی یا رسول سمجھے نہ معصوم اور نہ ہی کسی کا یہ منصب اور مرتبہ سمجھے کہ اس کے ماننے پر انسان کا مومن و مسلم سمجھا جانا منحصر ہو۔

نیز اسی کے متضمّنات کی حیثیت سے یہ بھی لازم آتا ہے کہ:

۷۔ یہ تسلیم کیا جائے کہ آپؐ نے جو نظام قائم فرمایا، اور جو خلافتِ راشدہ کے دوران بتمام وکمال قائم رہا، وہی دین حق اور نظامِ اسلامی کی صحیح ترین اور واحد مسلّمہ تعبیر ہے۔ گویا خلافتِ راشدہ فی الواقع ''خلافت علیٰ منہاج النبوۃ'' تھی اور خلفائے اربعہ یعنی حضرت ابوبکر صدیقؓ، عمر فاروقؓ، عثمان غنیؓ اور علی حیدر رضی اللہ تعالیٰ عنھم وارضاھم نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے وہ ''خلفائے راشدین ومہدیین'' ہیں جن کی سنت آنحضورؐ کے بعد دین میں حجت کا درجہ رکھتی ہے۔

۸۔ یہ یقین رکھا جائے کہ صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین جنہیں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت اور آپؐ کی تعلیم اور تزکیہ وتربیت سے براہِ راست فیض یاب ہونے کی سعادت نصیب ہوئی من حیث الجماعت پوری اُمت میں افضلیت مطلقہ کے حامل ہیں۔ حتیٰ کہ کوئی غیر صحابی کسی صحابی سے افضل نہیں ہوسکتا۔ ان کی محبت جزو ایمان ہے، ان کی تعظیم وتوقیر دراصل نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعظیم وتوقیر ہے اور ان سے بغض وعداوت اور ان کی تحقیر وتوہین درحقیقت آنحضورؐ سے بغض وعداوت اور آپؐ کی تحقیر و توہین ہے ____ ان کے مابین جزوی فضیلت کے بہت سے پہلو ہو سکتے ہیں لیکن فضیلت کلّی متعین طور پر اس طرح ہے کہ تمام صحابہؓ میں ایک اضافی درجۂ فضیلت حاصل ہے حضرات اصحاب بیعت رضوان کو، پھر ان پر ایک مزید درجہ فضیلت حاصل ہے حضرات اصحاب بدر کو، پھر ان پر ایک اور درجہ فضیلت کے حامل ہیں حضرات عشرۂ مبشرہ اور ان میں فضیلت مطلقہ حاصل ہے، حضراتِ خلفاء اربعہ کو جن کی افضلیت علیٰ ترتیب الخلافت ہے یعنی افضل البشر بعد الانبیاء بالتحقیق ہیں حضرت ابوبکر صدیقؓ، پھر درجہ ہے حضرت عمر فاروقؓ کا، پھر مقام ہے حضرت عثمان غنیؓ کا اور پھر مرتبہ ہے حضرت علی حیدرؓ کا!

مزید برآں صحابہ کرامؓ کُل کے کُل ''عدول'' ہیں اور ان کے مابین اختلاف ونزاع نفسانیت کی بناء پر نہیں بلکہ خطائے اجتہادی کی بنا پر ہوا۔ چنانچہ مشاجراتِ صحابہؓ کے باب میں محتاط ترین روش تو یہ ہے کہ ''کفِّ لِسان'' سے کام لیا جائے اور کامل سکوت اختیار کیا جائے تاہم کوئی حقیقی اور واقعی ضرورت ہی لاحق ہو جائے تو ایک کو ''مصیب''، یعنی صحیح مؤقف پر اور دوسرے کو ''مخطی''، یعنی راہِ خطائے اجتہادی پر تو قرار دیا جاسکتا ہے لیکن کسی کو بھی سبّ وشتم یا الزام واتہام کا ہدف بنانا جائز نہیں ہے!

(ج) ہر قسم کے کفر اور جملہ انواع واقسام شرک اور تمام رذائل وذمائم اخلاق سے شعوری طور پر اعلانِ براءت کرے، بایں الفاظ کہ:

اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِکَ مِنْ اَنْ اُشْرِکَ بِکَ شَیْئًا وَّ اَنَا اَعْلَمُ بِهٖ وَاَسْتَغْفِرُکَ لِمَا لَا اَعْلَمُ بِهٖ تُبْتُ عَنْهُ وَتَبَرَّاْتُ مِنَ الْکُفْرِ وَالشِّرْکِ وَالْکِذْبِ وَالْغِیْبَۃِ وَالْبِدْعَۃِ وَالنَّمِیْمَۃِ وَالْفَوَاحِشِ وَالْبُھْتَانِ وَالْمَعَاصِیْ کُلِّھَا

یعنی ''اے اللہ میں تیری پناہ مانگتا ہوں اس سے کہ تیرے ساتھ کسی کو جانتے بوجھتے شریک کروں اور تجھ سے مغفرت کا طلب گار ہوں اگر کبھی بے سمجھے بوجھے ایسا ہو جائے اور میں اعلان براءت کرتا ہوں ہر نوع کے کفر سے، شرک سے، جھوٹ سے، غیبت سے، بدعت سے، چغلخوری سے، بے حیائی کے کاموں سے، بہتان طرازی سے اور جملہ نافرمانیوں سے۔''

تشریح: ایمان کی طرح کفر کی بھی دو قسمیں ہیں ایک کفر حقیقی یا کفر قلبی اور دوسرے کفرِ قانونی یا کفرِ ظاہری ____ کفرِ حقیقی یا کفر قلبی کا اطلاق اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی ناقدری و ناشکری اور اس تعالیٰ کی ہر

معصیت اور ہر نافرمانی پر ہوجاتا ہے لیکن جہاں تک اُس کفر قانونی یا کفر شرعی کا تعلق ہے جس کی بناء پر کسی کی تکفیر کر کے اس کا رشتہ ملتِ اسلامی سے منقطع کر دیا جائے تو وہ ضروریات دین میں سے کسی کے انکار ہی سے لازم آتا ہے، مجرد بے عملی یا، نافرمانی حتیٰ کہ کبائر کے ارتکاب سے بھی لازم نہیں آتا۔

اسی طرح شرک کی بھی بے شمار اقسام ہیں بعض شرک اعتقادی ہیں اور بعض صرف عملی، بعض جلی ہیں اور بعض خفی، تاہم جملہ انواع و اقسام شرک کا ایک احصاء اور احاطہ اس طرح ممکن ہے کہ ایک شرک فی الذّات ہے یعنی یہ کہ کسی کو کسی اعتبار سے خدا کا ہم جنس، یا ہم کفو بنا دیا جائے جس کا کامل رد ہے سورہ اخلاص میں۔ دوسرے شرک فی الصفات ہے یعنی کسی کو کسی صفت کے اعتبار سے خدا کا مثل یا مثیل بنا دیا جائے جس کا نہایت مکمل سدباب ہے آیت الکرسی میں، اور تیسرے شرک فی الحقوق ہے جس کی جامع ترین تعبیر شرک فی العبادت ہے جس کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ کوئی خدا سے بڑھ کر یا اُس جتنا محبوب و مطلوب ہوجائے اور یہ بھی کہ کسی کو علی الاطلاق مطاع مان لیا جائے یعنی اس کی اطاعت خدا کی اطاعت سے آزاد تسلیم کر لی جائے، اور یہ بھی کہ عام مادی قانون اور ظاہری قواعد و ضوابط کے دائرے سے باہر کسی سے استعانت اور استمداد و استغاثہ کیا جائے یا اس سے دُعا کی جائے اور اسے پکارا جائے (عام مادی قوانین کے تحت بھی اگر کسی کے بارے میں یہ خیال ہو کہ محض اپنی قوت اور ارادے سے کسی کو نفع یا ضرر پہنچا سکتا ہے تو یہ شرک فی الصفات کی ایک قسم یعنی شرک فی القدرت اور شرک فی التصرف ہوگا) مزید برآں شرک کی اسی نوع کے ذیل میں آتے ہیں ریا اور سمعہ بھی اور کسی کے لئے کسی بھی نیت سے ان مراسم عبودیت کو بجالانا بھی جو صرف اللہ کے لئے خاص ہیں جیسے سجدہ اور نذر!

رذائل و ذمائم اخلاق کی مکمل فہرست دینا ممکن نہیں تاہم اگر انسان ان سے اجتناب کرے جو اُوپر بیان ہوئے تو دوسروں کا سدباب خود بخود ہوجائے گا۔

(د) سابقہ زندگی کے تمام گناہوں پر نہایت الحاح و زاری سے بارگاہِ خداوندی میں مغفرت کا طلبگار ہو اور آئندہ کے لئے کامل خلوص و اخلاص کے ساتھ توبہ کرے ان الفاظ کے ساتھ کہ:

اَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ رَبِّی مِنْ كُلِّ ذَنْبٍ اَذْنَبْتُهٗ عَمَدًا اَوْ خَطَاً سِرًّا اَوْ عَلَانِيَةً وَّ اَتُوْبُ اِلَيْهِ مِنَ الذَّنْبِ الَّذِیْ اَعْلَمُ وَمِنَ الذَّنْبِ الَّذِیْ لَا اَعْلَمُ اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ وَسَتَّارُ الْعُيُوْبِ وَغَفَّارُ الذُّنُوْبِ

"یعنی میں اللہ سے معافی کا خواستگار ہوں تمام گناہوں پر خواہ میں نے جان بوجھ کر کیے ہوں یا غیر ارادی طور پر، اور خواہ چھپ چھپا کر کیے ہوں خواہ علانیہ طور پر، اور خواہ وہ میرے علم میں ہوں خواہ میرے علم میں نہ ہوں۔ اے اللہ تو ہی تمام غیبوں کا جاننے والا اور تمام عیبوں کی پردہ پوشی کرنے والا اور تمام گناہوں کی بخشش فرمانے والا ہے!"

تشریح: توبہ صرف زبان سے کلماتِ توبہ کے ادا کر دینے یا ان کے ورد یا وظیفہ بنا لینے کا نام نہیں ہے۔ بلکہ گناہ پر حقیقی ندامت اور واقعی پشیمانی اور معصیت سے کلی اجتناب کے عزمِ مصمّم کے ساتھ بارگاہِ خداوندی میں رجوع کرنے اور گناہ و معصیت کو بالفعل ترک کر دینے کا نام ہے یہ تین شرائط ان کوتاہیوں کے ضمن میں کافی ہیں جو حقوق اللہ کے باب میں ہوں، حقوق العباد سے تعلق رکھنے والے معاصی کے لئے ایک چوتھی اضافی شرط یہ ہے کہ جس کسی پر زیادتی ہوئی ہو اس کی تلافی کی جائے یا اس سے معافی حاصل کی جائے۔

بنابریں توبہ کی صحت کے لئے لازم ہے کہ جو شخص تنظیم اسلامی میں شمولیت کا خواہاں ہو وہ:

۱۔ جملہ فرائض دینی کی پابندی اختیار کرے اور تمام کبائر سے فی الفور مجتنب ہوجائے۔ بالخصوص ارکان اسلام کی پوری پابندی کرے۔ چنانچہ نماز قائم کرے (مردوں کے لئے التزام جماعت بھی ضروری ہے) رمضان المبارک کے روزے رکھے، صاحبِ نصاب ہو تو باقاعدہ حساب کے ساتھ پوری زکوٰۃ ادا کرے اور صاحبِ استطاعت ہو اور تاحال حج بیت اللہ نہ کیا ہو تو فوراً نیت کرے اور جلد از جلد فریضہ حج ادا کرے۔

۲۔ سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا زیادہ سے زیادہ اتباع کرے اور ایسی تمام بدعات اور رسومات کو ترک کر دے جن کا ثبوت قرونِ مشہود لہا بالخیر میں نہ ملتا ہو۔

تشریح: ان بدعات و رسومات کا زیادہ زور شادی بیاہ، پیدائش، عقیقہ، ختنہ، سالگرہ، فوتیدگی اور تہواروں کے مواقع پر ہوتا ہے۔ ان سب میں لازم ہوگا کہ اپنے معاملات کو زیادہ سے زیادہ قرونِ اولیٰ کے مطابق بنایا جائے اور بعد کے اضافوں کو ترک کر دیا جائے۔

۳۔ اپنی معاشرت میں جملہ اسلامی احکام کی پابندی کرے خصوصاً ستر اور حجاب کے شرعی احکام پر عمل پیرا ہو۔

۴۔ اگر کوئی ایسا ذریعہ معاش رکھتا ہو جو معصیت فاحشہ کے ذیل میں آتا ہو جیسے چوری، ڈاکہ، سود، زنا، شراب، رقص و سرور، شہادتِ زور، رشوت، خیانت، جوا اور سٹہ وغیرہ تو اسے ترک کر دے۔

تشریح: اس بات کا تو بظاہر احوال کوئی امکان نظر نہیں آتا کہ وہ لوگ تنظیم اسلامی میں شمولیت کے خواہاں ہوں جن کی معاش چوری یا ڈاکہ، شراب کی تیاری یا اس کی فروخت وغیرہ، عصمت فروشی یا رقص و سرور ایسے قبیح کاموں سے متعلق ہوں تاہم اگر اللہ تعالیٰ ایسے کسی کاروبار سے متعلق کسی فرد کو اصلاح کی توفیق دے تو یہ بھی اس کی رحمت سے بعید نہیں۔ بہرصورت ان تمام کاموں کی حرمت اور قباحت و شناعت ہمارے معاشرے میں معلوم و معروف ہے ____ البتہ بعض حرام چیزیں کچھ اس طرح ہمارے

معاشرے میں جاری وساری ہوگئی ہیں کہ عام لوگ یا تو ان کی قباحت سے ہی آگاہ نہیں رہے یا انہوں نے کسی مجبوری کے عذر کی بنیاد پر اُن کو اپنے لئے مباح کرلیا ہے۔ ان میں سے مکروہ ترین چیز ہے سُود، جس سے باز نہ آنے پر قرآن حکیم اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے اعلان جنگ کی وعید سناتا ہے اور دوسرے نمبر پر ہے رشوت اور سرکاری حیثیت اور اختیار کا ناجائز استعمال اور ان پر مستزاد ہیں بیع وشرا کی بعض ناجائز صورتیں اور سرکاری محاصل (انکم ٹیکس ڈیوٹی وغیرہ) سے بچنے کے لئے اخفاء وکذب بیانی۔

ہمیں خوب اندازہ ہے کہ اس وقت جو خدا ناشناس اور عاقبت ناآشنا نظام پوری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لئے ہوئے ہے اور پورا انسانی معاشرہ بحیثیت مجموعی جس فساد اخلاقی میں مبتلا ہے اس کے پیش نظر ان تمام چیزوں سے کامل اجتناب نہایت مشکل اور صبر آزما کام ہے لیکن تنظیم اسلامی جن مقاصد کے لئے قائم کی جارہی ہے اس کے پیش نظر لازم ہے کہ اس سے عملی وابستگی کے لئے وہی لوگ آگے بڑھیں جو رخصتوں اور حیلوں پر عمل کرنے کے بجائے عزیمت اور صبر وتوکل کو اپنا شعار بنائیں اور ہر اس ذریعہ معاش کو ترک کرنے کی کوشش کریں جس میں حرام کی آمیزش ہو۔ اس معاملے میں سردست حسب ذیل تصریحات پر اکتفا کی جاتی ہے۔

(i) سود لینا اور دینا قطعاً حرام ہیں لہٰذا بنکوں یا دیگر اداروں سے نہ کبھی کوئی رقم کسی بھی غرض کے لئے سود پر قرض لینا جائز ہے نہ سیونگ اکاؤنٹ یا فکسڈ ڈیپازٹ یا نقد رقم پر معینہ منافع کی کسی بھی دوسری صورت میں سرمایہ لگانا درست ہے۔ چنانچہ بنکوں سے صرف عام سروسز جیسے ترسیل زر یا لاکرز سے انتفاع یا زیادہ سے زیادہ کرنٹ اکاؤنٹ رکھنے کی سہولت حاصل کی جاسکتی ہے۔

(ii) کسی ایسے کاروباری ادارے کی ملازمت جائز نہیں ہے جس میں سود کو غالب عنصر کی حیثیت حاصل ہو جیسے بنک اور انشورنش کمپنیاں۔

(iii) رشوت لینا اور دینا دونوں حرام ہیں۔ البتہ کسی ایسی صورت میں کہ کسی ظالم اہل کار یا صاحب اختیار کو اپنا جائز حق وصول کرنے کے لئے کچھ مجبوراً دینا پڑے تو اس کا شمار استحصال بالجبر میں ہوگا۔ رشوت میں نہیں۔ البتہ یہ صرف اُسی صورت میں ہوگا کہ نہ کوئی ناجائز انتفاع مطلوب ہو، نہ کسی سرکاری قانون اور پابندی سے بچنا مقصود ہو اور نہ ہی کسی اور کے جائز حقوق پر زد پڑتی ہو۔

(iv) سرکاری محاصل کے ضمن میں جتنی رعائتیں مروجہ قانون کے اندر اندر ممکن ہوں ان سے بڑھ کر کسی ایسی صورت کو اختیار کرنا درست نہیں ہے جس میں کذب، فریب اور شہادت زور شامل ہوں۔

(v) کاروبار کی مختلف صورتوں میں سے بھی جن جن میں بیع فاسد یا جوئے یا سٹے یا احتکار وغیرہ کا عنصر شامل ہو اس سے بچنا لازم ہے۔

(vi) اگر اس کے قبضے میں ایسا مال یا جائیداد ہو جو حرام طریقے سے آیا ہو یا جس میں حق داروں کے تلف کردہ حقوق شامل ہوں تو اس سے دستبردار ہو جائے اور اہل حقوق کو ان کے حق پہنچا دے۔ البتہ یہ عمل صرف اس صورت میں کرنا لازم ہے جب کہ حق دار بھی معلوم ہوں اور وہ مال بھی معلوم و متعین ہو جس میں ان کا حق تلف ہوا ہے۔ بصورت دیگر توبہ اور آئندہ کے لئے طرز عمل کی اصلاح کافی ہوگی۔

(۵) گہرے احساسِ ذمہ داری کے ساتھ اعلان کرے کہ وہ ہر طرف سے یکسو ہر کر صرف اللہ کا ہو کر رہے گا، رضائے الٰہی ہی اس کا اصل مقصود ومطلوب ہوگی اور نجات وفلاحِ اُخروی کا حصول ہی اس کا اصل نصبُ العین ہوگا ـــــــ اور جس طرح اس کی نماز اور قربانی صرف اللہ کے لئے ہوگی اسی طرح اس کے جسم و جان، مال ومنال حتیٰ کہ زندگی اور موت سب اللہ ہی کے لئے ہوں گے۔ یعنی:

اِنِّی وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّمَا اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ O

ـــــــ اور ـــــــ اِنَّ صَلٰوتِیْ وَ نُسُكِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ O

لَا شَرِیْكَ لَهٗ وَبِذٰلِكَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ O

تشریح: ہر ذی شعور مسلمان کا اولین فرض یہ ہے کہ وہ اللہ کی محبت سے سرشار ہو کر اپنی پوری زندگی اس کی کامل اطاعت میں دے دے (جو لازماً اطاعتِ رسولؐ ہی کے واسطے سے ہوگی!) اسی رویے کا نام عبادتِ رب ہے جو ہر انسان سے اللہ کا پہلا مطالبہ ہے اور جس کی طرف نوعِ انسانی کو دعوت دینے کے لئے تمام انبیاء ورسل مبعوث ہوئے اور جو ازروئے قرآن جنوں اور انسانوں کا عین مقصد تخلیق ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس پر لازم ہے کہ اپنی صحت وقوت، فرصت وفراغت، صلاحیت واستعداد، مال ودولت، اور وسائل وذرائع کا زیادہ سے زیادہ حصہ تواصی بالحق اور تواصی بالصبر، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر، احقاقِ حق اور ابطالِ باطل، دعوت الی اللہ اور تبلیغ دین، نصرتِ دینِ خدا اور رسولؐ اور حمایت واقامتِ دین، اور شہادتِ حق علی الناس اور اظہارِ دینِ حق علی الدین کلّہٖ کے لئے وقف کر دے اور اس کے لئے محنت ومشقت، انفاق وایثار، ترک واختیار، ابتلا و آزمائش، صبر ومصابرت، استقامت ومقاومت ـــــــ الغرض ہجرت اور جہاد فی سبیل اللہ کے جملہ مراحل کے لئے مقدور بھر ہمت وعزیمت کی راہ اختیار کرے۔ یہ تمام فرائض ہر مسلمان پر حسبِ صلاحیت و استعداد اور مطابقِ وسعت وقوت عائد ہوتے ہیں اور ان کی انجام دہی میں ہی بندے کی وفاداری کا اصل امتحان ہے!

(و) خدا کو حاضر و ناظر جانتے ہوئے اور ''اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْؤُلًا'' کے پیشِ نظر پورے احساسِ مسؤلیت کے ساتھ عہد کرے کہ اپنے فرائضِ دینی کی انجام دہی کے لئے وہ نبی اکرم ﷺ کے فرمان مبارک کہ ''اَنَا اٰمُرُكُمْ بِخَمْسٍ: بِالْجَمَاعَةِ وَالسَّمْعِ وَالطَّاعَةِ وَالْهِجْرَةِ وَالْجِهَادِ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ'' کے مطابق تنظیم اسلامی کے نظم کی پوری پابندی کرے گا۔

تشریح: یہ بات اچھی طرح سمجھ لینے کی ہے کہ تنظیم اسلامی نہ عام معنی میں دنیوی یا سیاسی جماعت ہے نہ محدود مفہوم میں مذہبی تنظیم بلکہ یہ ایک ہمہ گیر 'دینی جماعت' ہے لہٰذا اگرچہ یہ خیال کرنا تو غلطی ہی نہیں عظیم گمراہی ہو گی کہ یہ اُس ''الجماعت'' کے حکم میں ہے جس میں شمولیت اسلام میں داخلے اور جس سے علیحدگی کفر کے مترادف ہے اور جس کے بارے میں نبی اکرم ﷺ نے فرمایا ہے کہ ''مَنْ شَذَّ شُذَّ فِي النَّار'' یعنی جو اس سے علیحدہ ہوگا وہ علیحدہ ہی جہنم میں جھونک دیا جائے گا ـــــ تاہم اس کے نظم کو عام معاشرتی و ثقافتی انجمنوں یا طبقاتی و پیشہ ورانہ تنظیموں یا سیاسی و قومی جماعتوں کے قواعد و ضوابط کی پابندی پر بھی قیاس نہیں کیا جا سکتا بلکہ اس کی ''اطاعت فی المعروف'' ـــــ ''سمع و طاعت'' کے خالص اسلامی اور ٹھیٹھ دینی اُصول کے مطابق تمام شرکائے تنظیم پر واجب ہے۔

حصہ سوم

فرائضِ دینی
کا
جامع تصور

جو

مارچ ۱۹۸۵ء میں مسلسل چھ روز

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

کے سالانہ محاضراتِ قرآنی میں زیر بحث رہا

(بعض لفظی ترامیم کے ساتھ)

ڈاکٹر اِسرار احمد

بسم اللہ الرَّحمٰنِ الرَّحِیم

فرائض دینی کا جامع تصور

☆ تمہید: علم اور عمل

انسانی شخصیت کے دو رُخ ہیں: ایک علم دوسرے عمل _____ اسلام میں علمِ صحیح کا مظہرِ اتم 'ایمان' ہے جبکہ عملِ صحیح کی اساس تصورِ فرائض پر قائم ہے۔ 'ایمان' انسان کو علمِ حقیقت ہی عطا نہیں فرماتا صحیح محرک عمل بھی دیتا ہے، اس اعتبار سے اوّلین اہمیت اسی کی ہے، چنانچہ ایمان کی ماہیت، اس کی تفاصیل، اس کے درجات، اس کے حصول کے ذرائع اور اس کے لوازم و ثمرات اہم ترین موضوعات ہیں لیکن موجودہ محاضرات میں اصل بحث ان پر نہیں بلکہ 'تصورِ فرائضِ دینی' پر ہے!

☆ تین اساسی فرائض

ایک مسلمان کے 'اساسی دینی فرائض' تین ہیں:

(۱) ایک یہ کہ وہ خود صحیح معنی میں اللہ کا بندہ بنے!

☆ اس کے لئے چار اساسی اصطلاحات ہیں: اسلام، اطاعتِ خدا اور سول، تقویٰ اور عبادت۔

☆ یہ کیفیات انسان میں ہمہ تن، ہمہ وقت اور ہمہ وجوہ مطلوب ہیں نہ کہ جزوقتی ____ اِلّا یہ کہ کبھی غفلت کے باعث یا جذبات کی رَو میں بہہ کر یا ماحول کے اثرات سے مغلوب ہو کر کوئی غلط حرکت سرزد ہو جائے، تو اس پر فوری توبہ اللہ کے یہاں مقبول ہو گی۔ (النساء: ۱۷)

اس کے برعکس اگر جان بوجھ کر کوئی ایک 'معصیت' بھی مستقل طور پر اختیار کر لی گئی اور اس پر اصرار ہوا تو اس سے نہ صرف تمام نیکیوں کے ضائع چلے جانے یعنی حبطِ اعمال کا اندیشہ ہے بلکہ اس کا بھی خطرہ ہے کہ ''المعاصی بریدُ الکفر'' کے مطابق ایمان بالکل زائل ہو جائے اور انسان خلود فی النار کا مستحق ہو جائے۔ اِلّا یہ کہ حقیقی اور واقعی 'اضطرار' موجود ہو۔!!

(۲) دُوسرے یہ کہ دوسروں کو حتی المقدور اسلام کی تبلیغ کرے اور دین کی دعوت دے!

☆ اس کے لئے یوں تو بے شمار اصطلاحات ہیں جیسے انذار، تبشیر، تذکیر، وعظ، نصیحت، وصیت،

تعلیم، تبیین، تلقین، وغیرہ۔ لیکن اہم تر اصطلاحات چار ہی ہیں (۱) تبلیغ (۲) دعوت (۳) امر بالمعروف و نہی عن المنکر (۴) شہادت علی الناس

☆ یہ خود انسان کی اپنی شرافت و مروت کا تقاضا بھی ہے اور ابنائے نوع کی ہمدردی و خیر خواہی کا تقاضا بھی، لیکن سب سے بڑھ کر یہ سید المرسلین محمدؐ رسول اللہ ﷺ پر ختمِ نبوت کا منطقی نتیجہ ہے کہ اب تا قیامِ قیامت تمام انسانوں پر اللہ اور اس کے رسولؐ کی جانب سے اتمامِ حجت یعنی ''شہادت علی الناس'' کی ذمہ داری بحیثیتِ مجموعی اُمّت محمد علی صاحبہا الصلوٰۃ والسّلام کے کندھوں پر ہے!

(۳) تیسرے یہ کہ وہ اللہ کے کلمے کی سربلندی اور اس تعالیٰ کے دینِ حق کے بالفعل قیام اور غلبے کے لئے تن، من، دھن سے کوشاں ہو۔

☆ اس کیلئے قرآن حکیم کی پانچ اساسی اصطلاحات ہیں: تکبیرِ رب، اقامتِ دین، ''اِظْهَارُ دِيْنُ الْحقِ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ'' ''لِيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّـهٗ لِلّٰهِ'' اور ''لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ''۔

☆ حدیث نبویؐ میں ایک چھٹی اصطلاح وارد ہوئی ہے: ''لِتَكُوْنَ كَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا'' ______ اور

☆ تین عام فہم تعبیرات ہیں: قیامِ حکومتِ الٰہیہ، نفاذِ نظامِ اسلامی، اور اسلامی انقلاب!

متذکرہ بالا تین فرائض کی باہمی نسبت اور اُن کا ایمان اور ارکانِ اسلام کے ساتھ ربط و تعلق ایک ایسی سہ منزلہ عمارت کی مثال سے خوب واضح ہو جاتا ہے جس کی ____ (i) ایک زیرِ زمین بنیاد ہے جو نظر نہیں آتی لیکن پوری عمارت کی مضبوطی اور پائیداری کا دارو مدار اسی پر ہے۔ (ii) اسی بنیاد کا ایک حصہ زمین سے باہر ہے جو نظر آتا ہے جسے عرفِ عام میں 'کرسی' اور انگریزی میں Plinth کہتے ہیں۔ (iii) پہلی منزل پر صرف چار ستون ہیں، دیواریں تعمیر نہیں کی گئیں، ظاہر ہے کہ اُوپر کی پوری تعمیر کا وزن ان ہی کے ذریعے بنیاد تک پہنچتا ہے۔ (iv) ستونوں پر پہلی چھت قائم ہے۔ (v) دوسری چھت بھی اگرچہ ان ستونوں ہی پر قائم ہے لیکن دیواروں کی تعمیر کے باعث ستون نظر نہیں آتے۔ (v) اس کے اُوپر تیسری اور آخری چھت ہے اور اُس کا بھی معاملہ یہی ہے ____!

اس مثال میں: (ا) زیرِ زمین بنیاد ____ ایمان کا ''تصدیقٌ بالقلب'' والا حصہ یعنی یقینِ قلبی ہے!

____ (ب) بنیاد کا نظر آنے والا حصہ ____ ''اقرارٌ باللّسان'' ____ یعنی کلمہ شہادت!

(ج) چار ستون چار عبادات کی نمائندگی کرتے ہیں یعنی نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج۔ (د) پہلی چھت اسلام، اطاعت، تقویٰ اور عبادت کی نمائندگی کرتی ہے (ھ) دوسری چھت ____ تبلیغ، دعوت، امر بالمعروف و نہی عن المنکر اور شہادت علی الناس سے عبارت ہے ____ اور (و) تیسری اور آخری چھت تکبیرِ رب، اقامتِ دین، اظہارِ دین، اعلاءِ کلمۃ اللہ یا قیامِ حکومتِ الٰہیہ کی مظہر ہے ____! واللہ اعلم!!

☆ تین لوازم

اِن تین اساسی فرائض سے عہدہ برآ ہونے کے لئے تین لوازم لابُدَّ منہ ہیں:

(۱) دوامِ 'جہاد فی سبیل اللہ' جس کا ظہور:

☆ فریضۂ اوّل کے ضمن میں (i) نفسِ امّارہ (ii) شیطانِ لعین اور اس کی ذریتِ صلبی و معنوی اور (iii) بگڑے ہوئے معاشرے کے غلط رجحانات اور دباؤ ____ کے خلاف جدّ و جہد اور زور لگانے کی صورت میں ہوتا ہے اور حدیث نبویؐ کی رُو سے یہی 'افضل الجہاد' ہے۔

☆ فریضۂ ثانی کے ضمن میں دعوت و تبلیغ کے لئے جان و مال کھپانے کی صورت میں ہوتا ہے، اور

☆ فریضۂ ثالث کے ضمن میں سر دھڑ کی بازی لگانے اور جان ہتھیلی پر رکھ کر باطل کی قوتوں سے 'بالفعل' اور 'بالید' پنجہ آزمائی کی صورت میں ہوتا ہے جس کے لئے تن، من، دھن لگا دینے کا عزم، حتیٰ کہ جان دے دینے کی 'آرزو' کا ہونا لازمی ہے!

گویا جہاد کی پہلی منزل مجاہدہ مع النفس اور آخری منزل قتال فی سبیل اللہ!

واضح رہے کہ اسی کا 'منفی پہلو' ہجرت ہے، چنانچہ اس کی بھی پہلی منزل ''اَنْ تَهْجُرَ مَا كَرِهَ رَبُّكَ'' ہے اور آخری یہ کہ اقامتِ دین کی جدوجہد میں وقت آنے پر گھر بار، مال و منال اور اہل و عیال کو چھوڑ کر نکل جایا جائے!

جہاد کی پہلی دو منزلوں کے لئے آلہ و ہتھیار قرآن مجید ہے یعنی 'جہاد بالقرآن' چنانچہ 'مجاہدہ مع النفس' کا مؤثر ترین ذریعہ ہے قرآن کے ساتھ قیام اللیل یا تہجد! اور دعوت و تبلیغ کا پورا عمل بھی قرآن حکیم ہی کی اساس پر اُسی کے ذریعے ہونا چاہئے!!

تیسری اور آخری منزل پر عہدِ حاضر میں 'جہاد بالید' کی موزوں ترین صورت فواحش و منکرات کے خلاف پُرامن مظاہرے ہیں، لیکن اس میں نوبت فقہاءِ کرام کی طے کردہ شرائط کے تحت قتال یعنی جہاد 'بالسیف' تک بھی آ سکتی ہے۔

(۲) لُزومِ اجتماعیت، جس کا تقاضا:

☆ فریضہ اوّل کے ضمن میں صرف صحبتِ صالح (بفحوائے: ''کُوْنُوْا مَعَ الصَّادِقِیْنَ'') سے پورا ہو سکتا ہے۔

☆ اسی طرح فریضۂ ثانی کے ضمن میں درسگاہوں، اداروں، انجمنوں اور سوسائٹیوں سے پورا ہوسکتا ہے!

☆ اسی طرح فریضۂ ثالث کے ضمن میں 'سمع و طاعت فی المعروف' کے ٹھیٹھ اسلامی اور عسکری اصول پر مبنی جماعت کے بغیر پورا نہیں ہوسکتا (اور یہی مراد ہے آنحضورﷺ کے ان الفاظِ مبارکہ سے کہ:

''اٰمُرُکُم بِخَمْسٍ: بِالْجَمَاعَةِوَالسَّمْعِ وَالطَّاعَةِوَالْهِجْرَةِ وَالْجِهَادِ فِي سَبِيْلِ اللّٰهِ.'' (رواہ احمد والترمذی عن الحارث الاشعریؓ)

(۳) بیعت ____ جو ____

☆ پہلے دو فرائض کے ضمن میں 'بیعتِ سلوک وارشاد' کی صورت میں کفایت کرتی ہے لیکن:

☆ فریضۂ ثالث کے ضمن میں 'بیعت سمع و طاعت فی المعروف' کی صورت لازمی و لابدی ہے! چنانچہ اُسی کی جانب اشارہ ہے مسلمؒ کی روایت (عن عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہما) میں جس میں آنحضورﷺ کے یہ الفاظ مبارکہ وارد ہوئے ہیں کہ ''مَنْ مَّاتَ وَلَيْسَ فِيْ عُنُقِهٖ بَيْعَةٌ مَاتَ مِيْتَةً جَاهِلِيَّةً'' اس لئے کہ نارمل حالات میں تو دو ہی صورتیں ممکن ہیں:

(i) اگر کم سے کم شرائط و معیارات پر اُترنے والا صحیح اسلامی نظامِ حکومت قائم ہے تو اُس کے سربراہ سے بیعتِ سمع و طاعت فی المعروف ہوگی ____ اور (ii) اگر ایسا نہیں ہے تو صحیح اسلامی حکومت کے قیام کے لئے جدوجہد کرنے والی جماعت کے امیر کے ہاتھ پر بیعتِ سمع و طاعت فی المعروف ہوگی ____ تیسری ممکنہ صورت صرف ایسے عظیم اور شدید فتنے ہی کی ہوسکتی ہے جس میں حدیث نبویﷺ میں وارد الفاظ کے مطابق سویا ہوا شخص جاگنے والے سے بہتر ہو، بیٹھا ہوا شخص کھڑے ہونے والے سے بہتر ہو اور کھڑا رہنے والا شخص چلنے والے سے بہتر ہو! ____ اعاذنا الله مِنْ ذلك

☆ نتیجہ

(۱) انجمن خدام القرآن کا مقصد ہے 'جہاد بالقرآن' یہی وجہ ہے کہ ۱۹۷۲ء میں اس کے قیام کے وقت اس کے جو 'اغراض و مقاصد' معین ہوئے وہ یہ تھے (i) عربی زبانی کی تعلیم و ترویج (ii) قرآن مجید کے مطالعہ کی عام ترغیب و تشویق (iii) علومِ قرآنی کی عمومی نشر و اشاعت (iv) ایسے نوجوانوں کی مناسب تعلیم و تربیت جو 'تعلیم و تعلم قرآن' کو مقصدِ زندگی بنالیں ____ اور (v) ایک ایسی قرآن اکیڈمی کا قیام جو قرآن حکیم کے فلسفہ و حکمت کو وقت کی اعلیٰ ترین علمی سطح پر پیش کر سکے، اور

(۲) تنظیم اسلامی ہے 'جملہ دینی فرائض' کی انجام دہی بالخصوص اقامتِ دین یا اسلامی انقلاب کے لئے 'بیعت ہجرت و جہاد فی سبیل اللہ و سمع و طاعت فی المعروف' پر مبنی خالص دینی جماعت!!